arshia
وبھوتی نارائن رائے
ہاشم پورہ
۲۲ مئی
ترجمہ: ارجمند آرا

ہاشم پورہ

22 مئی
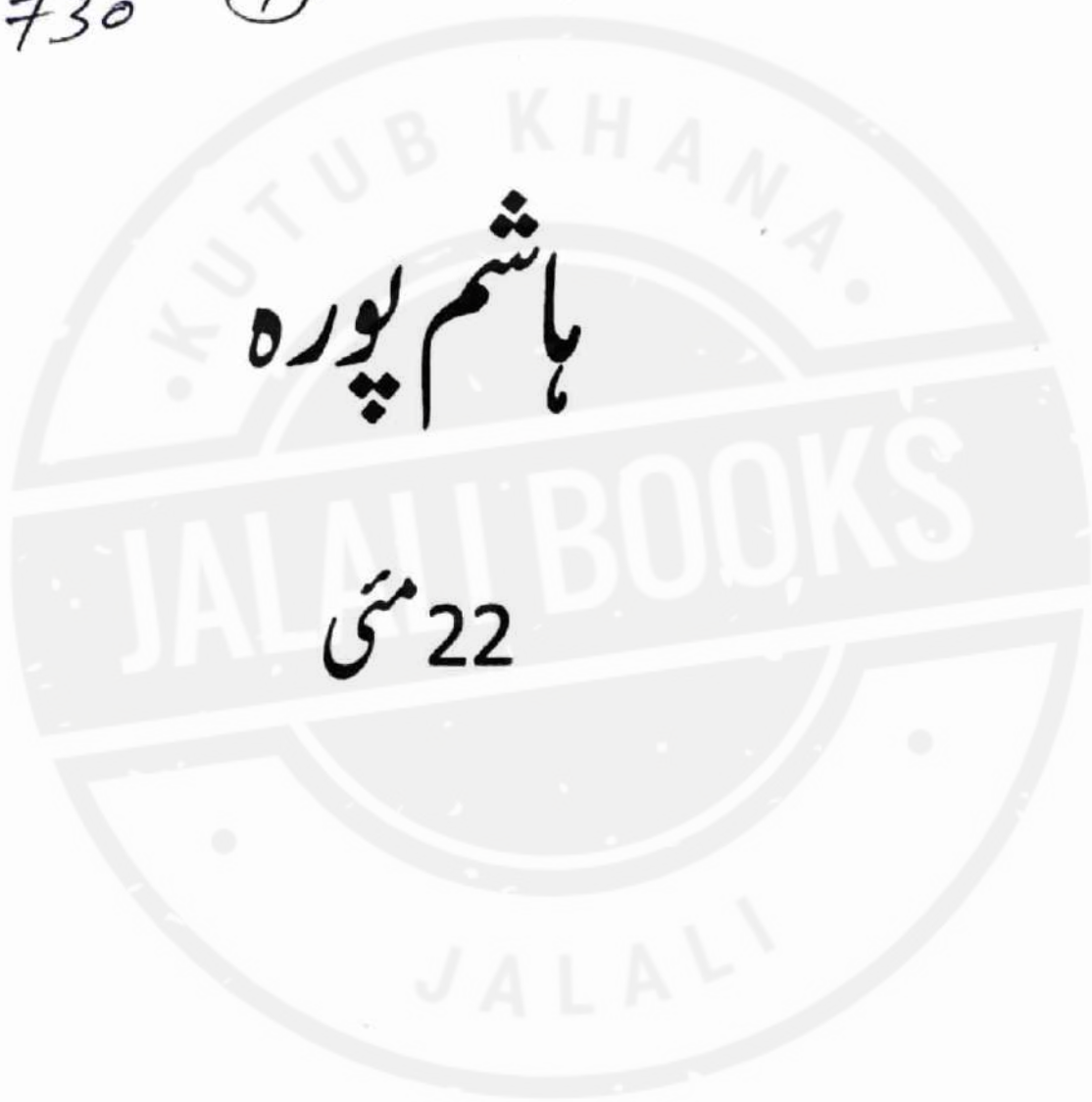
1

مریں تو غیر کی گلیوں میں

اس رات میں دس ساڑھے دس بجے ہاپڑ سے غازی آباد لوٹا تھا۔ن میرے ساتھ ضلع مجسٹریٹ نسیم زیدی تھے جنھیں ان کے بنگلے پر اتارتا ہوا میں پولیس ادھیکشک نواس (رہائش گاہ پولس سپرنٹنڈنٹ) پہنچا۔نواس کے گیٹ پر جیسے ہی کار کی ہیڈ لائٹیں پڑیں، مجھے گھبرایا ہوا اور اڑی رنگت والا چہرہ لیے سب انسپکٹر وی بی سنگھ دکھائی دیا جو اس وقت لنک روڈ تھانے کا انچارج تھا۔ میرا تجربہ بتا رہا تھا کہ اس کے علاقے میں کوئی سنگین واردات ہوئی ہے۔ میں نے ڈرائیور کو کار روکنے کا اشارہ کیا اور نیچے اتر آیا۔

وی بی سنگھ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ اس کے لیے ڈھنگ سے کچھ بھی بتا پانا ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ ہکلاتے ہوئے اور ٹوٹے پھوٹے جملوں میں اس نے جو کچھ بتایا وہ مجھے جامد کر دینے کے لیے کافی تھا۔ میری سمجھ میں اتنا آ گیا کہ اس کے تھانے کے علاقے میں کہیں نہر کے کنارے پی اے سی (Police Armed Constabulary) نے کچھ مسلمانوں کو مار دیا ہے۔ کیوں مارا؟ کتنے لوگوں کو مارا؟ کہاں سے لا کر مارا؟ یہ واضح نہیں تھا۔ میں نے اسے کئی بار اپنے حقائق کو دہرانے کے لیے کہا، اور پورے واقعاتی تسلسل کے ٹکڑے جوڑ کر ایک بیانیہ تیار کرنے کی کوشش کی۔ جو تصویر بنی اس کے مطابق وی بی

سنگھ تھانے میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ لگ بھگ 9 بجے اسے مکن پور کی طرف سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ اسے اور تھانے میں موجود دوسرے پولیس کرمیوں کو لگا کہ گاؤں میں ڈکیتی پڑ رہی ہے۔ آج مکن پور گاؤں کا نام صرف ریوینیو ریکارڈس میں ہی بچا ہے۔ آج کی فلک بوس رہائشی عمارتوں، مال اور تجارتی فاؤنڈیشنوں والے مکن پور میں لیکن 1987 میں دور دور تک بنجر زمین پھیلی ہوئی تھی۔ اسی بنجر زمین کے درمیانی چک روڈ پر وی بی سنگھ کی موٹر سائیکل دوڑنے لگی۔ اس کے پیچھے تھانے کا ایک داروغہ اور ایک اور سپاہی بیٹھے تھے۔ وہ چک روڈ پر سو گز بھی نہیں پہنچے تھے کہ سامنے تیز رفتار سے آتا ہوا ایک ٹرک دکھائی دیا۔ اگر انھوں نے بروقت اپنی موٹر سائیکل چک روڈ سے نیچے نہ اتار دی ہوتی تو ٹرک انھیں کچل دیتا۔ اپنا توازن برقرار کرتے ہوئے جو کچھ انھوں نے دیکھا، اس کے مطابق ٹرک پیلے رنگ کا تھا، اس کے پچھلے حصے پر 41 لکھا ہوا تھا اور سیٹوں پر خاکی کپڑے پہنے کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ کسی پولیس والے کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ پی اے سی کی 41 ویں بٹالین کا ٹرک پی اے سی کے عملے کو لے کر ان کے سامنے سے گزرا ہے۔ لیکن اس سے گتھی کچھ اور الجھ گئی۔ اس وقت مکن پور گاؤں سے پی اے سی کا ٹرک کیوں آرہا تھا؟ گولیوں کی آواز کے پیچھے کیا راز تھا؟ وی بی سنگھ نے موٹر سائیکل واپس چک روڈ پر ڈالی اور گاؤں کی طرف بڑھا۔ مشکل سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر جو نظارہ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے دیکھا وہ رونگٹے کھڑا کر دینے والا تھا۔ مکن پور گاؤں کی آبادی سے پہلے چک روڈ ایک نہر کو کاٹتی تھی۔ نہر آگے جا کر دہلی کی سرحد میں داخل ہو جاتی تھی۔ جہاں چک روڈ اور نہر ایک دوسرے کو کاٹتے تھے وہاں ایک پلیا تھی۔ پلیا پر پہنچتے پہنچتے وی بی سنگھ کی موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ جب نہر کے کنارے اُگے سرکنڈوں کی جھاڑیوں پر پڑی تو انھیں گولیوں کی آواز کا راز سمجھ میں آ گیا۔ چاروں طرف خون کے تازہ تھکے تھے۔ ابھی خون پوری طرح سے جما نہیں تھا اور زمین پر اسے بہتے دیکھا جا سکتا تھا۔ نہر کی پٹری پر، جھاڑیوں کے بیچ اور پانی کے اندر رستے ہوئے زخموں والے بدن

بکھرے پڑے تھے۔ وی بی سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے جائے واردات کا ملاحظہ کر کے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہاں کیا ہوا ہوگا؟ ان کی سمجھ میں صرف اتنا آیا کہ وہاں پڑی لاشوں اور راستے میں نظر آئے پی اے سی کے ٹرک میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ ساتھ کے سپاہی کو جائے واردات پر نگرانی کے لیے چھوڑتے ہوئے وی بی سنگھ اپنے ساتھی داروغہ کے ساتھ واپس شاہراہ کی طرف لوٹا۔ تھانے سے تھوڑی دور غازی آباد دہلی مارگ پر پی اے سی کی 41 ویں بٹالین کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ دونوں سیدھے وہیں پہنچے۔ بٹالین کا صدر دروازہ بند تھا۔ کافی دیر بحث کرنے کے باوجود سنتری نے انھیں اندر جانے کی اجازت نہیں دی۔ تب وی بی سنگھ نے ضلع مکھیالیہ (ہیڈ کوارٹرز) آ کر سب کچھ مجھے بتانے کا فیصلہ کیا۔

جتنا کچھ آگے ٹکڑوں ٹکڑوں میں بیان کیے گئے ماجرے سے میں سمجھ سکا اس سے صاف ظاہر تھا کہ جو کچھ ہوا ہے وہ بہت ہی بھیانک ہے اور اگلے روز غازی آباد جل سکتا ہے۔ پچھلے کئی ہفتوں سے پڑوس کے ضلعے میرٹھ میں فرقہ وارانہ فسادات چل رہے تھے اور اس کی لپٹیں غازی آباد پہنچ رہی تھیں۔ میں نے سب سے پہلے ضلع مجسٹریٹ نسیم زیدی کو فون کیا۔ وہ سونے جا ہی رہے تھے۔ انھیں جاگے رہنے کے لیے کہہ کر میں نے ضلع مکھیالیہ پر موجود اپنے ایڈیشنل ایس پی، چند ڈپٹی ایس پی اور مجسٹریٹوں کو فون کر کر کے جگایا اور تیار ہونے کے لیے کہا۔ مجھے پتا تھا کہ 41 ویں بٹالین کے کمانڈنٹ جودھ سنگھ بھنڈاری شہر میں رہتے ہیں کیونکہ ابھی بٹالین کی عمارت بننے کا کام اپنے ابتدائی مراحل میں ہی تھا۔ انھیں بھی خبر دینے کا اہتمام کیا گیا اور اگلے چالیس پینتالیس منٹ میں سات آٹھ گاڑیوں میں لدے پھندے ہم لوگ مکن پور گاؤں کی طرف لپکے۔ وہاں پہنچنے میں ہمیں مشکل سے پندرہ بیس منٹ لگے ہوں گے۔ نہر کی پلیا سے کچھ ہی پہلے ہماری گاڑیاں کھڑی ہو گئیں۔ نہر کے دوسری طرف تھوڑی دور پر ہی مکن پور گاؤں کی آبادی تھی لیکن کوئی گاؤں والا وہاں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لگتا تھا کہ دہشت نے انھیں گھروں

کے اندر دبکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ تھانہ لنک روڈ کے کچھ پولیس کرمی ضرور وہاں پہنچ گئے تھے۔ان کی ٹارچوں کی روشنی کے کمزور دائرے نہر کے کنارے اُگی گھنی جھاڑیوں پر پڑ رہے تھے لیکن ان میں کچھ بھی صاف دیکھ پانا مشکل تھا۔ میں نے گاڑیوں کے ڈرائیوروں سے نہر کی طرف رخ کر کے اپنی ہیڈ لائٹس آن کرنے کے لیے کہا۔لگ بھگ سو گز چوڑا علاقہ روشنی میں نہا گیا۔اس روشنی میں جو کچھ نظر آیا وہ کسی ڈراونے خواب کی طرح میرے حافظے پر ثبت ہے۔

گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کی روشنیاں جھاڑیوں سے ٹکرا کر ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھیں اس لیے ٹارچوں کا بھی استعمال کرنا پڑ رہا تھا۔ جھاڑیوں اور نہر کے کنارے خون کے تھکے ابھی پوری طرح سے جمے نہیں تھے،ان میں سے خون رس رہا تھا۔ پٹری پر بے ترتیبی سے لاشیں پڑی تھیں کچھ پوری جھاڑیوں میں پھنسی تو کچھ آدھی تہائی پانی میں ڈوبی ہوئی۔ لاشوں کی گنتی کرنے یا نکالنے سے زیادہ ضروری مجھے اس بات کی پڑتال کرنا لگا کہ ان میں سے کوئی زندہ ہے یا نہیں۔ وہاں موجود ہم سب لوگوں نے الگ الگ سمتوں میں ٹارچوں کی روشنیاں پھینک پھینک کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کوئی زندہ ہے یا نہیں۔ بیچ بیچ میں ہم ہانک بھی لگاتے رہے کہ اگر کوئی زندہ ہو تو جواب دے...ہم لوگ دشمن نہیں دوست ہیں...اسے اسپتال لے جائیں گے۔لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ مایوس ہو کر ہم میں سے کچھ لوگ پلیا پر بیٹھ گئے۔

میں نے اور ضلع مجسٹریٹ نے طے کیا کہ وقت گنوانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمارے پڑوس میں میرٹھ جل رہا تھا اور 60 کلومیٹر دور بیٹھے ہم اس کی آنچ سے جھلس رہے تھے۔ افواہوں اور شرارتی عناصر سے جوجھتے ہوئے ہم لوگ شہر کو مسلسل اس آگ سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ سوچ کر دہشت ہو رہی تھی کہ کل جب یہ لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے ضلع مکھیالیہ پہنچیں گی تو افواہوں کو پر لگ جائیں گے اور پورے شہر کو تشدد کی آگ جلا کر راکھ کر سکتی ہے۔ ہمیں دوسرے دن کی حکمت عملی بنانی تھی،اس لیے جونیئر افسروں

کو لاشیں نکالنے اور ضروری لکھا پڑھی کرنے کے لیے کہہ کر ہم لنک روڈ تھانے جانے کے لیے مڑے ہی تھے کہ نہر کی طرف سے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ سبھی ٹھٹھک کر رک گئے۔ میں واپس نہر کی طرف لپکا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ واضح تھا کہ کوئی زندہ ہے لیکن اسے یقین نہیں ہے کہ جو لوگ اسے تلاش کر رہے ہیں وہ دوست ہیں۔ ہم نے پھر آوازیں لگانی شروع کر دیں، ٹارچ کی روشنی الگ الگ لاشوں پر ڈالی اور آخر میں حرکت کرتے ہوئے ایک جسم پر ہماری نظریں اٹک گئیں۔ کوئی دونوں ہاتھوں سے جھاڑیاں پکڑے آدھا جسم نہر میں ڈبوئے اس طرح پڑا تھا کہ غور سے دیکھے بغیر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ زندہ ہے یا مردہ! دہشت سے بری طرح کانپتا اور کافی دیر تک تسلی دینے کے بعد یہ یقین کرنے والا کہ ہم اسے مارنے نہیں بلکہ بچانے والے ہیں، جو شخص اگلے کچھ گھنٹوں میں ہمیں اس اشتعال انگیز واردات کی جانکاری دینے والا تھا، اس کا نام باب الدین تھا۔ گولی دو جگہ اس کا گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ خوف سے بے ہوش ہو کر جھاڑیوں میں گرا تو بھاگ دوڑ میں اس کے قاتلوں کو پوری طرح یہ جانچنے کا موقع نہیں ملا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔ دَم سادھے وہ آدھا جھاڑیوں اور آدھا پانی میں پڑا رہا اور اس طرح موت کے منہ سے لوٹ آیا۔ اسے کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی اور نہر سے سہارا دے کر نکالے جانے کے بعد اپنے پیروں پر چل کر وہ گاڑیوں تک آیا تھا۔ بیچ میں پلیا پر بیٹھ کر تھوڑی دیر سستایا بھی تھا۔

لگ بھگ 21 برس کے بعد جب ہاشم پورہ پر کتاب لکھنے کے لیے مواد اکٹھا کرتے وقت میری اس سے ملاقات ہاشم پورہ میں اسی جگہ ہوئی جہاں سے پی اے سی اسے اٹھا کر لے گئی تھی، تو وہ میرا چہرہ بھول چکا تھا لیکن تعارف ہوتے ہی جو پہلی بات اسے یاد آئی یہ تھی کہ پلیا پر بیٹھے اسے میں نے کسی سپاہی سے مانگ کر بیڑی دی تھی۔

باب الدین نے اس دن ہمیں جو کچھ بتایا اس کے مطابق اس دن سہ پہر کو تلاشیوں کے دوران پی اے سی کے ایک ٹرک پر بٹھا کر چالیس پچاس لوگوں کو لے جایا گیا تو انھوں

نے سمجھا کہ انھیں گرفتار کر کے جیل لے جایا جا رہا ہے۔ وہ لگاتار انتظار کرتے رہے کہ جیل آئے گا اور انھیں اتار کر اس کے اندر داخل کر دیا جائے گا۔ وہ سبھی برسہا برس سے میرٹھ میں رہتے تھے اور کچھ تو یہیں کے آبائی باشندے تھے۔ اس لیے کرفیو لگی سونی سڑکوں پر جیل پہنچنے میں لگنے والا وقت کچھ زیادہ تو لگا لیکن باقی سب کچھ اتنا فطری تھا کہ انھیں اس کا ذرا سا بھی اندازہ نہیں ہوا جو تھوڑی دیر بعد گزرنے والا تھا۔ جب نہر کے کنارے ایک ایک کو اتار کر مارا جانے لگا تب انھیں راستے بھر اپنے قاتلوں کے خاموش چہروں اور سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے بات کرنے کا راز سمجھ میں آیا۔

اس کے بعد کی کہانی ایک لمبی اور اذیت دہ انتظار کی کہانی ہے جس میں حکومت ہند اور اقلیتوں کے رشتے، پولیس کا غیر پیشہ ورانہ رویہ، اور گھسٹ گھسٹ کر چلنے والی بیزار کن عدالتی کارروائی جیسے سوال جڑے ہوئے ہیں۔ میں نے 23 مئی 1987 کو جو مقدمے غازی آباد کے تھانہ لنک روڈ اور مراد نگر میں درج کرائے تھے وہ 28 برسوں تک مختلف رکاوٹوں سے ٹکراتے ہوئے عدالتوں میں چلتے رہے اور 21 مارچ 2015 کو سبھی 16 ملزموں کی رہائی پر ان کا پہلا مرحلہ ختم ہو گیا ہے۔

میں مسلسل سوچتا رہا ہوں کہ کیسے اور کیونکر ہوئی ہو گی ایسی خوفناک واردات؟ ہوش و حواس میں کیسے ایک عام آدمی کسی کی جان لے سکتا ہے؟ وہ بھی ایک کی نہیں پورے گروہ کی؟ بغیر کسی ایسی دشمنی کے جس کے کارن آپ غصے سے پاگل ہوئے جا رہے ہوں؟ کیسے آپ کسی نوجوان کے سینے سے سٹا کر اپنی رائفل کا گھوڑا دبا سکتے ہیں؟ بہت سارے سوال ہیں جو آج بھی مجھے متھتے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب تلاشنے کے لیے ہمیں اس دور کو یاد کرنا ہو گا جب یہ واردات ہوئی تھی۔ بڑے خراب تھے وہ دن۔ لگ بھگ دس برس سے شمالی ہندوستان میں چل رہے رام جنم بھومی آندولن نے پورے سماج کو بری طرح بانٹ دیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ جارحیت اختیار کرتی جا رہی اس تحریک نے خاص طور سے ہندو مڈل کلاس کو بے یقینی کی حد تک فرقہ پرست بنا دیا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد سب سے

زیادہ فرقہ وارانہ فسادات اسی دور میں ہوئے تھے۔ فطری بات تھی کہ فرقہ پرستی کے اس طوفان سے پولیس اور پی اے سی کے جوان بھی اچھوتے نہیں رہے تھے۔ پی اے سی پر تو پہلے سے بھی فرقہ پرست ہونے کے الزامات لگتے رہے ہیں۔ میں نے اس کتاب کے سلسلے میں وی کے بی نائر سے، جو فسادات کے شروعاتی دور میں میرٹھ کے سینئر پولیس سپرنٹنڈنٹ تھے، ایک طویل انٹرویو لیا تھا۔ جو واقعات 23 سال بعد بھی انھیں یاد تھے ان میں سے ایک واقعہ بڑا دلدوز تھا۔ فسادات شروع ہونے کے دوسرے یا تیسرے روز ایک رات شور شرابہ سن کر جب وہ اپنی خواب گاہ سے باہر نکلے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کے دفتر میں کام کرنے والا مسلمان اسٹینوگرافر بنگلے کے باہر بیوی بچوں کے ساتھ کھڑا ہے اور بری طرح دہشت زدہ اس کے بچے چیخ چلا رہے ہیں۔ پتا چلا کہ پولیس لائن میں رہنے والے اس خاندان پر وہاں ڈیرے ڈالے ہوئے پی اے سی کے جوان کئی دنوں سے فقرے کس رہے تھے اور آج اگر اپنے کچھ پڑوسیوں کی مدد سے وہ لوگ نکل بھاگے نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ ان کے کوارٹر پر حملہ کر کے انھیں مار دیا جاتا۔ فسادات کے دوران یہ خاندان ورِشٹھ پولیس ادھیکشک نواس میں پناہ لیے پڑا رہا۔ انھی دنوں جب میرٹھ سے کچھ مسلمان قیدی فتح گڑھ جیل لے جائے گئے تو ان میں سے کئی کو وہاں کے قیدیوں اور وارڈروں نے حملہ کر کے مار ڈالا۔ ہاشم پورہ کانڈ کی ذمہ دار، 41 ویں بٹالین کے ہی ایک مسلمان کانسٹبل ڈرائیور افتخار احمد کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ اُس دور کی صداقت کو اچھی طرح سے متعارف کرا سکتا ہے۔ 21 مئی کو دوپہر کے بعد وہ ٹرک نمبر URU-1493 سے فورس لے کر میرٹھ پولیس لائنز پہنچا۔ اسی ٹرک میں اس کے ساتھ بعد میں اس واردات کا ملزم بنا پلاٹون کمانڈر سریندر پال سنگھ بھی میرٹھ آیا تھا۔ پولیس لائن میں پی اے سی کے جوانوں کے ہاتھوں مسلم قیدیوں کی مار پیٹ کو جب اس نے روکنے کی کوشش کی تو اس کے ساتھیوں نے اسی پر حملہ کر دیا اور افسروں کو اسے چھپا کر اس کی جان بچانی پڑی۔ ایسے ہی بھیانک تھے وہ دن۔ ان دنوں کے بارے میں تفصیل سے آگے لکھوں

گا۔

پھر بھی وہ اس حد تک کیسے گئے ہوں گے؟— میں اس گتھی کو سلجھانا چاہتا تھا۔ میں قاتلوں کی اس ذہنیت کو سمجھنا چاہتا تھا جس کے تحت بغیر کسی جان پہچان یا ذاتی دشمنی کے انھوں نے نہتے اور اپنی محافظت میں موجود نوجوان لڑکوں کو ایک ایک کر کے بھون ڈالا اور بے بس، زمین پر چھٹپٹاتے گھائلوں پر تب تک گولیاں چلائیں جب تک انھیں یقین نہیں ہو گیا کہ ان کا کام تمام ہو گیا ہے۔ میں نے 23 سال ان سوالوں کے جواب تلاشنے میں لگائے ہیں اور اب جب کہ کافی حد تک یہ گتھی سلجھ گئی ہے، میں اپنی کتاب پر کام کرنے بیٹھا ہوں۔

مجھے افسوس ہے کہ پلاٹون کمانڈر سریندر پال سنگھ، جو اس پوری کتھا کا نایک یا کھلنایک ہے، اب مر چکا ہے اور اس کے ساتھ گزاری وہ بہت ساری گھڑیاں بیکار ہو گئی ہیں جن کے دوران میں نے اس ذہنیت کو سمجھنے کی کوشش کی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنی رہنمائی میں ایک چھوٹی سی ٹکڑی سے ایسا گھناونا کام کروا پایا ہوگا۔ میرے حافظے میں اور بات چیت کے بعد لکھے گئے چھٹ پٹ نوٹوں میں کئی دلچسپ چیزیں درج ہیں لیکن میں اب ان کا استعمال بہت کم، اور ضروری ہونے پر ہی کروں گا جس سے کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ میں نے اس میں کچھ اپنی طرف سے جوڑا یا گھٹایا ہے۔ اسی طرح پی اے سی کی اکتالیسویں بٹالین کے اس وقت کے کمانڈنٹ جودھ سنگھ بھنڈاری بھی اب زندہ نہیں ہیں، اس لیے ان کے ساتھ ہوئی اپنی لمبی بات چیت کا ذکر بھی اشد ضروری ہونے پر ہی کروں گا۔

❁ ❁ ❁

2

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

موت سے اتنے قریب کا سامنا کہ جب آپ کی آنکھ کھلے تو آپ اپنے اردگرد پڑے مردہ اور نیم مردہ جسموں کو چھو کر یقین دلانا چاہیں کہ آپ ابھی زندہ ہیں۔ پگھلا ہوا لوہا جب آپ کی عضلات کو چیرتا ہوا باہر نکلے تب تک آپ کی حواس اتنے سن ہو چکے ہوں کہ زندگی سے موت میں داخلہ ایسا ہو جیسے روئی کے گالے آکاش میں اڑیں، جہاں چاہے کچھ بھی ہو لیکن درد نہ ہو، خوف نہ ہو اور اتنا وقت بھی نہ ہو کہ یادیں آپ کو پریشان کر سکیں۔ آپ کے اردگرد گرجتی ہوئی رائفلوں کا شور ہو، اور ساتھ ہوں اس شور کو شدید ہیجان سے بھرتی ہوئی قاتلوں کی چیخ چیخ کر دی ہوئی گالیاں اور ان دونوں کے بیچ ایک سن پن کے احساس کے ساتھ اسلحے کا انتظار کہ جب اگل بغل سے گزرتی کوئی گولی آپ کے جسم میں یوں داخل ہو گی کہ آپ کا جسم ایک پل کے لیے زمین سے اچھلے اور اینٹھتا ہوا گر پڑے۔ ایسی موت کو آپ کیا کہیں گے؟ خاص طور سے تب جب کہ اپنے قاتل کو آپ پہلی مرتبہ غور سے دیکھ رہیں ہوں اور لاکھ کوشش کرنے پر بھی آپ کو ایسی کوئی وجہ نظر نہ آئے کہ آپ اس کے ہاتھوں قتل ہوں۔ باب الدین، مجیب الرحمٰن، محمد نعیم، عارف، ذوالفقار ناصر یا محمد عثمان کو کیسا لگا ہو گا جب موت سے چند سیکنڈ دوران انھوں نے اپنے دوستوں، رشتہ

داروں یا ساتھ محنت مجوری کرنے والوں کو مروڑ کھا کر اینٹھتے اور زمین پر گر کر چھٹپٹاتے دیکھا ہوگا اور سن حواس والے ان کے بدن بھاگنے جیسا فطری ردعمل بھی ظاہر نہ کر سکے ہوں گے؟ جان بچانے کے لیے سب نے ایک جیسی ہی حرکت کی تھی۔ بدن کے کسی حصے میں گولی لگنے کے بعد سبھی الگ الگ زاویوں سے زمین پر گرے لیکن قریب آتی موت سے بچنے کی کوشش ایک جیسی ہی ہوئی۔ واردات کے دونوں مقام، جہاں ان 42 انسانوں کو اتار کر گولی ماری گئی تھی، ایک جیسے ہی تھے۔ دونوں ہی نہروں کے کنارے تھے اور دونوں ہی نہروں میں پانی تیز رفتار سے بہہ رہا تھا۔

ہر بچنے والے نے گولی لگنے کے بعد دھرتی پر ساکت، صامت لیٹ کر قاتلوں کو دھوکا دینے کی کوشش کی کہ وہ مر چکا ہے۔ سبھی نہر کے پانی میں اپنے دھڑ کا زیادہ حصہ ڈبوئے، سرکنڈے یا دوسری کسی جھاڑی کو پکڑے مردہ، نیم مردہ جسموں کے درمیان پڑے رہے کہ مارنے والے اپنا فریضہ ادا کرنے کی تسکین لے کر وہاں سے ہٹ جائیں۔ قاتلوں کے چلے جانے کے بعد بھی وہ دیر تک خون، پانی اور کیچڑ میں لت پت، حرکت کیے بغیر پڑے رہے۔ انھوں نے انسانی مزاج کی اس جبلت کے بھی برعکس کیا جس کے تحت مصیبت میں پڑا آدمی اپنے جیسے دو ہاتھوں دو پیروں والے جاندار کو دیکھتے ہی اس کی طرف مدد کے لیے جھپٹتا ہے۔ قاتلوں کے جانے کے گھنٹوں بعد بھی جائے واردات پر آنے والا ہر شخص انھیں قاتلوں کے گروہ میں سے لگتا تھا اور اسے دیکھ کر مدد مانگنا تو درکنار، وہ اپنے خول میں اور زیادہ سمٹ جاتے تھے۔ خاص طور سے اگر بعد میں آنے والا خاکی وردی میں ہو۔

گولی لگنے کے لگ بھگ تین گھنٹے بعد باب الدین سے میری ملاقات ہوئی۔ ایک مریل، پچکے گالوں والا اوسط قد کا لڑکا بھیگے پروں والی کسی گوریا کی مانند سہما ہوا ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ پتلون کے پانچوں میں نہر کی تلہٹی کی کیچڑ بھری تھی اور قمیص اتنی تر تھی کہ اگر اسے اتار کر نچوڑا جاتا تو ایک ادھ لیٹر پانی نکل آتا۔ مئی کی اس سڑی گرمی میں بھی اس

کا جسم بیچ بیچ میں سہر جاتا تھا۔ میں نے غور کیا کہ 20-19 سال کا، چیچک کے داغوں بھرے چہرے والا لڑکا بولتے وقت ہکلا ضرور رہا تھا لیکن اس کی آواز میں عجیب طرح کی بے نیازی اور لاتعلقی رمی ہوئی تھی۔ موت کے اتنے قریب پہنچنے والے آدمی میں آس پاس بکھرے ہوئے منظر کے تیئں ایسی بے حسی! جس لاتعلقی کے ساتھ اس نے ہاشم پورہ سے مکن پور کی یاترا کا بیان کیا اس سے مجھے اپنے بدن میں جھرجھری سی دوڑتی محسوس ہوئی تھی لیکن آج دو دہائیوں کے بعد میں سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ موت جب ہماری طرف جھپٹتی ہے تب ہمیں دہشت ضرور ہوتی ہے لیکن اگر کچھ دیر تک وہ ہماری ہم سفر رہے اور پھر ہمیں چھوڑتی ہوئی آگے چلی جائے تو شاید ہم اسی طرح کی لاتعلق اداسی سے بھر جاتے ہیں۔

باب الدین کے کپڑے گیلے تھے اور ان پر جگہ جگہ ہلکی سرخی مائل دھبے بھی تھے۔ ذرا غور سے دیکھنے پر صاف ہو گیا کہ بدن پر دو جگہ گیلی قمیص چپک سی گئی تھی اور ان پر پانی کے لگاتار لمس کے باوجود خون کے تھکے جم گئے تھے۔ پہلا زخم بائیں کانکھ کے نیچے پیٹھ کی طرف اور دوسرا سینے پر داہنی طرف تھا جہاں گاڑھا کتھئی رنگ نظر آرہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کی ان دونوں جگہوں پر گولی اس کے مانس کو چیرتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔

وہ تھکا اور اداس ضرور نظر آرہا تھا لیکن اپنے پیروں پر چل سکتا تھا۔ ہم اسے لے کر تھانہ لنک روڈ کی طرف بڑھے لیکن وہ دس قدم بھی نہیں چلا ہوگا کہ اس کی چال لڑکھڑانے لگی۔ شاید گھنٹوں سرکنڈوں کو پکڑ کر لٹکے رہنے کا اثر اب ظاہر ہونے لگا تھا۔ ایک سپاہی نے سہارا دے کر اسے راستے میں پڑنے والی پلیا پر بیٹھا دیا۔ مئی کے آخری ہفتے میں، جب مانسون ابھی دور ہو اور بارش کا کہیں اتا پتا نہ ہو تب بھی، غازی آباد اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں اتنی اُمس ہوتی ہے کہ آپ پسینے میں نہائے رہتے ہیں۔ ہم سبھی تھکن اور چپچپاہٹ سے پست ہو رہے تھے۔ صرف باب الدین تھا جو بیچ بیچ میں کانپ اٹھتا تھا۔ 21 سال بعد، جب میں اس کتاب کو لکھنے کے لیے مواد جمع کر رہا تھا تو باب

الدین سے اسی ہاشم پورہ میں ملا جہاں سے پی اے سی اسے اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ اٹھا کر لے گئی تھی۔ تعارف ہوتے ہی اس نے مسکراتے ہوئے مجھے یاد دلایا تھا کہ مئی کی اس سڑی گرمی میں سہرتے دیکھ کر ایک سپاہی سے مانگ کر میں نے اسے بیڑی دی تھی۔ وہ بیڑی سگریٹ نہیں پیتا تھا اس لیے اس نے خاموشی سے سر ہلا کر منع کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے بولنا شروع کیا تو نہ جانے کتنی دیر تک بولتا ہی رہا۔ بیچ بیچ میں وہ سہرتا ضرور تھا لیکن خود کلامی کی مانند ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں جو کچھ وہ دیر تک بولتا رہا وہ اسے گھیر کر کھڑے آٹھ دس افسروں اور تھوڑی دور پر بیس پچیس کی تعداد میں موجود سرکاری عملے کے لیے کسی ڈراونے خواب سے کم نہیں تھا۔ وہ ایک ایسی داستان کا راوی تھا جو ناقابلِ یقین حد تک الم ناک تھی۔

وہاں رکنے کا کوئی مطلب نہیں تھا، جو کچھ باب الدین نے اب تک ہمیں بتایا تھا وہ اتنا بھیانک تھا کہ میں اور ضلع مجسٹریٹ نسیم زیدی، دونوں بھیڑ سے ہٹ کر آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے اور پھر اس پر متفق ہوئے کہ اگلے دن غازی آباد جل سکتا ہے۔ ہمیں دو سطحوں پر کارروائی کرنی تھی اور وہ بھی وقت گنوائے بغیر۔ پہلا کام تو تھا باب الدین سے پوری جانکاری حاصل کر ایف آئی آر درج کرانا اور سویرا ہوتے ہی نہر سے لاشوں کو نکلوا کر پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانا اور دوسری اس سے بھی اہم بات تھی اگلے دن یہ اہتمام کرنا کہ جب یہ لاشیں مارچری (مردہ گھر) پہنچیں تو افواہیں شہر کو جلا نہ دیں۔ جب سے میرٹھ میں آگ لگی تھی ہمارے دن رات اسی بھاگ دوڑ میں گزر رہے تھے کہ غازی آباد اس کی لپٹوں سے محفوظ رہے۔

کچھ لوگوں کو نگرانی کے لیے چھوڑ ہم باب الدین کو لے کر تھانہ لنک روڈ کے لیے نکل پڑے۔ لگ بھگ 60-50 گز کی دوری پر گاڑیاں پارک تھیں۔ میرے آگے دس بارہ لوگوں کا قافلہ ایک قطار میں چلا جا رہا تھا، دوسرے یا تیسرے نمبر پر باب الدین تھا، سر جھکائے ہوئے خاموشی سے بڑھتا ہوا۔ اس کے زخم ایسے نہیں تھے کہ اسے چلنے کے لیے

کسی سہارے کی ضرورت ہوتی، اس لیے اس نے شروع میں ہی سہارے کی پیش کش ٹھکرادی تھی۔ سڑی گرمی اور بدبودار پسینے سے لت پت وہ اندھیری رات اب تک میری یادوں میں معلق ہے جس میں اس پورے قافلے کے پیچھے کھڑے ہو کر میں نے بابالدین اور اس کے ساتھیوں کو گاڑیوں میں بیٹھتے دیکھ کر ایک اڑتی نظر اپنے پہلو میں کھڑے ہوئے ضلع مجسٹریٹ نسیم زیدی کی طرف ڈالی تھی اور ان کے راکھ ہو رہے چہرے کو دیکھ کر مجھے لگا تھا کہ انھیں بھی میری طرح کسی جنازے میں شرکت جیسا احساس ہو رہا ہے۔

قافلے کے لوگ کھڑی کاروں اور جیپوں میں سوار ہو گئے تو میں اور نسیم زیدی بھی ضلع مجسٹریٹ کی کار میں بیٹھ گئے۔ ہماری کار کے پیچھے پیچھے چار پانچ گاڑیاں اور تھیں۔ اگلے دس بارہ منٹ میں سب تھانہ لنک روڈ میں تھیں۔

تھانے تک پہنچتے پہنچتے ہمارا ارادہ بدل گیا اور ہم نے طے کیا کہ ہمیں بٹالین ہیڈکوارٹر جا کر ایک بار دیکھ لینا چاہیے کہ قاتل وہیں موجود ہیں یا بھاگ گئے؟ بابالدین کو تھانے میں ایک افسر کی نگرانی میں چھوڑ کر ضلع مجسٹریٹ کے ساتھ کچھ افسروں کو لے کر میں بٹالین کی طرف بڑھا۔ ہمارے ساتھ بٹالین کے کمانڈنٹ جودھ سنگھ بھنڈاری بھی تھے۔ جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے، وہ شہر میں رہتے تھے کیونکہ بٹالین کیمپس میں کمانڈنٹ کی رہائش گاہ ابھی تک تیار نہیں ہوئی تھی۔ وی بی سنگھ سے واقعہ کی اطلاع ملتے ہی میں نے نسیم زیدی کے علاوہ جن لوگوں سے رابطہ کیا تھا ان میں سے ایک بھنڈاری بھی تھے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ وہ تھانہ سنگھانی گیٹ کے پیچھے چار سرکاری فلیٹس کے ایک جھرمٹ میں رہتے تھے اور جب کافی دیر تک انھوں نے اپنا فون نہیں اٹھایا تو میں نے ان کے فلیٹ کے نیچے رہنے والے ڈپٹی ایس پی ہری شنکر شرما کو اوپر بھیجا تھا کہ وہ انھیں جگا کر مجھ سے بات کرائے۔ ہری شنکر شرما ہی بھنڈاری کو لے کر میرے پاس پہنچے تھے۔

ہم اکتالیسویں بٹالین کے گیٹ نمبر ایک پر پہنچے تو کمانڈنٹ بھنڈاری کی موجودگی کی

وجہ سے ہمیں گیٹ کھلوانے میں اس طرح کی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا جیسی لنک روڈ تھانے کے انچارج وی بی سنگھ کو اٹھانی پڑی تھی۔ ہم جب صدر دروازے سے اندر داخل ہوئے تو یہ واضح ہو گیا کہ بٹالین ابھی تعمیر کے ابتدائی مرحلے میں ہی ہے۔ ابھی بہت کم عمارتیں بنی تھیں، زیادہ تر غیر مستقل تعمیرات تھیں جن میں بٹالین کا کام کاج چل رہا تھا۔ ایسے ہی تین، چار کمروں پر مشتمل ایک عمارت کے سامنے، جو شاید مہمان خانہ یا آفیسرز میس تھا، لان میں کرسیوں پر بٹالین کے چار پانچ افسر بیٹھے تھے۔ کمانڈنٹ بھنڈاری ہمیں لے کر ادھر ہی بڑھ چلے۔ قریب پہنچتے ہی انھیں دیکھ کر سبھی کھڑے ہو گئے۔ ہم لان میں پہنچے تو ہمارے لیے بھی کرسیاں آ گئیں، اس نیم تاریک ماحول میں جب ایک دوسرے کے چہرے بھی صاف نظر نہیں آ رہے تھے، تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی، شاید ہر شخص دوسرے کے بولنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب یہ خاموشی ناقابل برداشت ہو گئی تو میں نے کمانڈنٹ بھنڈاری کے چہرے پر آنکھیں گڑا دیں۔ وہ جھٹکے سے اٹھے اور انھوں نے کرسی پر بیٹھے لوگوں میں سے ایک کو اشارہ کیا اور ایک اندھیرے کونے کی طرف بڑھ گئے۔ جسے اشارہ کیا گیا تھا اور جو شاید بٹالین کا ایڈ جوٹینٹ تھا، اٹھا اور ان کے پیچھے چل دیا۔

وہ دیر تک بتیاتے رہے اور ہم بے چینی سے ان کی باتیں ختم ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ تبھی بھنڈاری نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا۔ اندھیرے میں صاف تو نہیں سمجھ میں آیا لیکن لگا کہ وہ مجھے بلا رہے ہیں۔ میں ادھر کو لپکا۔ اس کے بعد بھنڈاری نے جو کچھ بتایا اس سے اس خوف ناک قتل عام کی تصویر کافی کچھ صاف ہوتی چلی گئی۔ میں نے کلکٹر نسیم زیدی کو بھی اشارے سے وہیں بلا لیا اور جتنا مجھے یاد آ رہا ہے ایک دو سینئر افسر اور آ گئے اور ہم سب بھنڈاری اور ان کے ایڈ جوٹینٹ کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ بھنڈاری نے ایک دو حصے ہی بتائے اور ایڈ جوٹینٹ سے پورا واقعہ بیان کرنے کے لیے کہا۔

کہانی مختصراً کچھ اس طرح تھی کہ رات لگ بھگ 9 بجے بٹالین کیمپس میں رہنے والے افسر رات کے کھانے کے بعد اسی لان میں بیٹھے گپیں لڑا رہے تھے کہ صدر دروازے سے زور زور کی آوازیں آتی سنائیں دیں۔ لگا کہ صدر دروازے کا سنتری کسی سے الجھا ہوا ہے۔ لان میں بیٹھے افسروں نے ایک جوان کو معاملہ جاننے کے لیے گیٹ کی طرف بھیجا لیکن اس کے وہاں تک پہنچنے کے پہلے ہی گیٹ کھلا اور انھوں نے ایک ٹرک کو تیزی سے بٹالین کیمپس میں گھستے ہوئے دیکھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد بھیجے گئے جوان کے ساتھ صدر دروازے کا سنتری بھی ان کے پاس چلا آیا۔ سنتری نے بتایا کہ جو ٹرک ابھی کیمپس میں گھسا تھا اس پر بیٹھ کر بٹالین کا صوبیدار سریندر پال سنگھ آیا تھا اور اس کے ساتھ کچھ جوان اور بھی تھے۔ سنتری نے جب سریندر پال سنگھ سے داخلی دروازے پر رکھے رجسٹر میں اندراج کرنے کے لیے کہا تو وہ اس سے الجھ گیا۔ سریندر پال سنگھ کے ساتھ آئے دوسرے پی اے سی کے عملے کے لوگ بھی ٹرک سے نیچے کود آئے اور انھوں نے سنتری کو لگ بھگ مجبور کرتے ہوئے گیٹ کھلوالیا اور رجسٹر میں اندراج کرائے بغیر ٹرک اندر لے گئے۔ افسروں کے لیے یہ خبر کچھ بے چین کرنے والی تھی کیونکہ انھیں پتا تھا کہ صوبیدار سریندر پال سنگھ کی ڈیوٹی میرٹھ میں تھی اور اس وقت اسے اور اس کے ساتھیوں کو اس ٹرک کے ساتھ میرٹھ میں ہونا چاہیے تھا۔

اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے تک ٹرک بٹالین کے اندر ایم ٹی پارکنگ میں کھڑا رہا۔ لانے والوں نے اسے اچھی طرح سے دھویا اور اسے لے کر پھر واپس میرٹھ کی طرف بھاگ گئے۔

اتنے سنگین واقعہ کی اطلاع ان افسروں نے اپنے کمانڈنٹ جودھ سنگھ بھنڈاری کو کیوں نہیں دی؟ یہ شک ہونے کے بعد بھی کہ سریندر پال سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے کوئی سنگین جرم کیا ہے، وہاں موجود افسروں نے انھیں روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ ابھی ٹرک بٹالین کیمپس میں ہی تھا کہ لنک روڈ تھانے کا انچارج وی بی سنگھ اس کا پیچھا کرتا ہوا بٹالین کے مین گیٹ تک پہنچا تھا، لیکن سنتری نے نہ تو اس کے لیے گیٹ کھولا اور

نہ ہی اس کے بار بار یہ بتانے کے باوجود کہ وہ کون ہے، اسے اندر آنے دیا۔ کیا اس کے پیچھے بھی بٹالین کے افسران کا حکم تھا؟ یہ کچھ ایسے بے جواب سوال ہیں جن کے بارے میں اس معاملے کی تفتیش کرنے والی ایجنسی کو چھان بین کرنی چاہیے تھی لیکن مجھے سی آئی ڈی کے دستاویزوں میں اس طرح کی کسی کوشش کے نشان نہیں ملے۔ ایڈ جوٹنٹ کے بیان، وی بی سنگھ کی بتائی ہوئی تفصیلات اور باب الدین کے بیان کو جوڑ کر دیکھنے سے یہ کافی کچھ واضح ہو گیا کہ مکن پور نہر پر مسلمانوں کو مارنے کے بعد سریندر پال سنگھ اور اس کے ساتھی ٹرک لے کر بھاگتے ہوئے اپنے بٹالین ہیڈ کوارٹر کی طرف آئے تھے۔ کنکریلے پتھریلے راستے پر انھیں سامنے کی سمت سے آتا ہوا موٹر سائیکل سوار وی بی سنگھ ملا تھا اور اسے لگ بھگ کچلتے ہوئے وہ اپنے ہیڈ کوارٹر کے گیٹ پر پہنچے اور سنتری کو مجبور کرتے ہوئے گیٹ کھلوا کر بٹالین کیمپس میں واقع ایم ٹی پارکنگ میں چلے گئے تھے۔

ایم ٹی پارکنگ فوجی یا پولیس انسٹی ٹیوٹس میں وہ مقام ہوتا ہے جس میں موٹر گاڑیاں کھڑی کی جاتی ہیں اور ان کی صاف صفائی یا رکھ رکھاؤ کیا جاتا ہے۔ میں کمانڈنٹ جودھ سنگھ بھنڈاری کو لے کر ایم ٹی کی طرف گیا۔ گاڑیوں کے گیراجوں کے سامنے پھیلا ہوا سیمنٹ کا پلیٹ فارم گیلا تھا۔ واضح تھا کہ سریندر پال سنگھ کی ٹکڑی نے اپنا ٹرک وہیں دھویا تھا۔ ٹارچ کی روشنیوں میں دیکھنے پر یہ بھی واضح ہو رہا تھا کہ پلیٹ فارم پر موجود چھوٹے موٹے گڈھوں میں لالی پن لیے گدلا پانی اکٹھا تھا۔ ظاہر تھا کہ یہ لال رنگ ٹرک پر جمے خون کے تھکوں کی دھلائی سے آیا ہو گا اور اس معاملے کی تفتیش میں اہم رول نبھانے والا تھا۔

ہم تھوڑا اور وقت بٹالین میں گزار کر لنک روڈ تھانہ لوٹ آئے۔

تھانے کے دفتر میں باب الدین بیٹھا تھا۔ ہم سیدھے تھانہ دار کے کمرے میں چلے گئے اور باب الدین کو وہیں بلا لیا گیا۔

ایک بار پھر پوچھ تاچھ کا سلسلہ شروع ہوا۔ ضلع مجسٹریٹ اور میرے ساتھ چار پانچ

افسر ایک میز کے تین طرف بیٹھ گئے۔ سامنے کی کرسی پر باب الدین کو بٹھا دیا گیا۔ ابتدائی جھجک دور ہوتے ہی اس نے اپنا بیان شروع کیا۔ اس بار وہ زیادہ مربوط گفتگو کر رہا تھا۔ شاید درمیانی وقفے نے اسے موت کے خوف سے آزاد کر دیا تھا اور ہماری خاکی اسے اپنے قاتلوں کی خاکی وردی سے مختلف لگنے لگی تھی۔ اس بار بولتے وقت وہ ٹکڑوں میں بیان نہیں کر رہا تھا۔ اس نے تفصیل سے اپنی گرفتاری کا ذکر کیا، اپنے ساتھ پکڑے گئے دوسروں کے بارے میں بتایا اور ان کے ساتھ پی اے سی ٹرک میں چڑھائے جانے کی بابت پورا قصہ بیان کیا۔ پچھلے اور اس بار کے بیان میں یکسانیت یہ تھی کہ اس کا لہجہ اس بار بھی پوری طرح سے غیر جذباتی اور اندر تک چھیل دینے والی ایک خاص طرح کی لاتعلقی سے لبریز تھا۔ میرے تجربے کے مطابق یہ پہلا واقعہ تھا کہ جس میں کوئی اتنے ٹھنڈے انداز میں موت سے اپنے قریبی تصادم کی تفصیلات پیش کر رہا تھا۔

پچھلی بار سے فرق یہ تھا کہ اس بار کا بیان ترتیب وار اور سدھا ہوا تھا۔ اسی لیے اس بار اس سے وہ بیورا نہیں چھوٹا جو اس معاملے میں بے حد اہم ثابت ہونے جا رہا تھا اور جسے سن کر ہم سبھی چونک گئے تھے۔ نہر سے نکالے جانے کے بعد سنائی گئی اپنی کہانی میں وہ یہ بتانا بھول گیا تھا کہ ہاشم پورہ سے اٹھائے گئے مسلمانوں کو لے کر تیز رفتار سے دوڑتا ہوا پی اے سی کا ٹرک میرٹھ غازی آباد مارگ پر اچانک داہنی طرف ایک نہر کی پٹری پر مڑ گیا تھا اور مین روڈ سے لگ بھگ پچاس گز اندر کھڑنجے پر اچھلتا کودتا جا کر رک گیا تھا۔ وہاں بھی وہی سب کچھ ہوا تھا جو لگ بھگ ایک گھنٹے بعد مکن پور کی نہر پر ہونے والا تھا۔

ٹرک کی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کی بغل میں بیٹھے پی اے سی کے جوانوں کے نہر کی پٹری پر کودنے اور ان کے بوٹوں کے کھڑنجے سے ٹکرانے سے پیدا ہونے والی آوازوں میں کچھ تو تھا جس نے پیچھے ٹھنسے لوگوں کو یہ احساس ضرور کرا دیا کہ کچھ ایسا ہونے جا رہا ہے جسے نہیں ہونا چاہیے تھا، اور جس کا تعلق انھی سے تھا۔ باب الدین کو اپنے پیٹ میں مروڑ سی اٹھتی محسوس ہوئی۔ فراغت پانے کی ایک ازلی خواہش اس کے دل میں اٹھی، لیکن چھٹی

حس نے اسے بتا دیا کہ اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

سامنے سے اترے کچھ لوگ تیزی سے ٹرک کے پیچھے آئے اور انھوں نے موٹی زنجیروں سے باندھے گئے لوہے اور لکڑی کے اس پٹرے کو کھول کر نیچے گرا دیا جو ٹرک کے پچھلے حصے کے لگ بھگ ایک تہائی حصے کو ڈھکے ہوئے تھا اور جس کی وجہ سے یہ حصہ کسی بند کمرے کا سا احساس کراتا تھا۔ پٹرے کے نیچے گرتے ہی اس سے لگ کر کھڑے پولیس کے جوان نیچے کود گئے۔ ان کی تیزی سے لگ رہا تھا کہ وہ جلدی میں ہیں اور گنوانے کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہے۔ ان کے بوٹ جب نیچے پڑے آڑے ترچھے بے ترتیب اینٹوں کے چھوٹے بڑے روڑوں سے ٹکرائے تو ان سے خوف پیدا کرنے والی آوازیں پیدا ہوئیں۔ کئی گھنٹے بعد بھی جب باب الدین اس واقعے کا ذکر کر رہا تھا تو میں نے، باوجود اس کی ساری لاتعلقی کے، اس کے چہرے پر وہی خوف دیکھا تھا جو اس آواز کو سن کر اس کے اور اس کے ہم سفر ساتھیوں کے چہروں پر تیرا ہوگا۔

دو تین جوانوں کو چھوڑ کر بقیہ نیچے کھڑے نجے پر تھے۔ ان میں سے کسی نے کڑکتی آواز میں اوپر ٹرک میں کھڑے لوگوں کو نیچے کودنے کے لیے للکارا۔ چھٹی حس نے باب الدین کو آگاہ کیا کہ نیچے سب کچھ نارمل نہیں ہے۔ وہ لگ بھگ باہری قطار میں تھا، للکار سنتے ہی اس نے اندر سرکنے کی کوشش کی۔ تبھی کہرام مچ گیا۔ باب الدین کی پیٹھ باہر کی طرف تھی اس لیے اسے نظر تو کچھ نہیں آیا لیکن پہلے کچھ لوگوں کے بے ترتیب ڈھنگ سے نیچے کودنے کی آوازیں سنائی دیں اور پھر گالیوں کے ساتھ گولیوں کا شور۔ سب کچھ گڈمڈ تھا لیکن اتنا سمجھ میں آ رہا تھا کہ کودنے والوں پر نیچے کھڑے پی اے سی کے جوان گولیاں چلا رہے ہیں۔ وہ فائرنگ کے ساتھ ساتھ چلا چلا کر گالیاں بھی بک رہے تھے۔ شاید یہ ان کی اپنے خوف اور گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش تھی۔ قاتلوں کی آوازیں تشدد آمیز ہیجان سے بھری ہوئی تھیں اور ان کی آوازوں کو ڈبونے والی وہ چیخیں تھیں جو مرنے والوں کی کراہوں، جاں بخشی کی التجاؤں اور تازہ زخموں کے درد سے پیدا کراہوں سے معمور تھیں۔

اچانک نیچے کھڑے کسی جوان نے اوپر ٹرک میں موجود جوانوں کو للکارا کہ نیچے کودنے سے گریز کرنے والے 'کٹوؤں' کو گرد نیا کر نیچے دھکیل دیں۔اوپر کھڑے جوانوں نے رائفل کے کندوں سے بغل میں کھڑوں کو ہریایا، پیچھے کھسکنے کی کوشش کر رہے لوگوں کو کالر پکڑ کر آگے کی طرف دھکیلا اور کچھ کو تو لگ بھگ بانہوں میں بھر کر نیچے پھینک دیا۔

ہر بار جب کسی کے نیچے گرنے کی آواز آتی،اسی کے ساتھ رائفل داغنے اور آدمی کے تڑپنے کی آواز بھی سنائی دیتی۔ باب الدین کو اپنی سانسیں گھٹتی ہوئی سی محسوس ہوئیں۔ ایک مضبوط ہاتھ کالر کے پچھلے حصے کو پکڑ کر اسے باہر کھینچ رہا تھا۔اس نے پوری طاقت لگا کر خود کو بھیڑ میں دھنسا کر آگے سرکنے کی کوشش کی۔ رسہ کشی جیسا کھیل شروع ہو گیا۔ لیکن یہ زیادہ دیر چلا نہیں۔ کچھ منٹوں کے وقفے میں ہی باب الدین نے سیال شیشہ اپنے بدن میں گھستا ہوا محسوس کیا اور گوشت کے جلنے کی جانی پہچانی گندھ اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔

اس کی بغل میں کھڑا کوئی اس کے کندھے کو دونوں ہاتھوں سے تھامنے کی ناکام کوشش کرتا ہوا دھیرے دھیرے نیچے سرک رہا تھا۔اس نے گھبرا کر دیکھا۔ یہ خون میں لت پت ایوب تھا،اس کے پاس والے کارخانے کے پاورلوم پر کام کرنے والا۔ اگل بغل کھڑے لوگوں کے چیخنے چلانے اور باہر سے آنے والی گالیوں کی للکار نے بنا پیچھے مڑے بھی یہ واضح کر دیا تھا کہ لوگوں کو نیچے اتارنے میں ناکام رہنے پر نیچے کھڑے قاتل اب ٹرک کے اندر ہی فائر جھونک رہے ہیں اور چیخ چیخ کر اندر موجود اپنے ساتھیوں سے گھائلوں کو باہر پھینکنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔

باب الدین کی ٹانگوں پر ایوب کی بانہوں کی مضبوط جکڑن دھیرے دھیرے ڈھیلی پڑ گئی۔ باب الدین نے کنکھیوں سے دیکھا اسے کوئی گھسیٹتا ہوا لے جا رہا تھا۔اس بیان کے برسوں بعد جب ہاشم پورہ میں ایک مرتبہ پھر وہ مجھے یہ واقعہ سنا رہا تھا،تو مجھے اس کے چہرے پر آج بھی ویسا ہی تاثر ہی نظر آیا تھا،اپنے بچپن کے دوست کو آخری بار دیکھنے اور

اس کے لیے کچھ نہ کر پانے والی یہی چھٹپٹاہٹ اس کے چہرے پر تب بھی تھی۔

باب الدین نے اپنے آس پاس سے لوگوں کو گھسیٹے جاتے دیکھا۔ پیچھے کی طرف کھینچے جانے والا ہر شخص پوری طاقت لگا کر آگے سرکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے کالر پر دباؤ ختم ہو گیا تھا۔ شاید اس کی مزاحمت سے جھلا کر اسے کھینچنے والا دوسرے شکاروں میں مصروف ہو گیا تھا۔ اچانک اسے اپنے پیٹ کی جلد پر گیلا پن محسوس ہوا۔ اس نے گھبرا کر گیلی جگہ پر ہاتھ پھیرا، اسے گولی لگی تھی۔ اسے وہ درد بھی محسوس ہوا جو مدھم سر کی لہروں کی طرح اس پوری جدوجہد کے بیچ جسم سے لگاتار ہولے ہولے بہہ رہا تھا اور بیچ بیچ میں پورے جسم کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ ایک بات آئینے کی طرح صاف تھی۔ اگر زندہ رہنا ہے تو اس ٹرک کے اوپر ہی رہنے کی کوشش جی جان سے کرنی ہوگی۔

اچانک ایسا کچھ ہوا جس کی توقع شکار اور شکاریوں میں سے کسی کو نہیں تھی۔ نہر کے کھڑنجے پر دور روشنی کا ایک گولا سا چمکا۔ پہلے ایک چھوٹا سا، مدھم روشنی کا دائرہ دکھائی دیا پھر وہ دھیرے دھیرے قریب آتا گیا، بتدریج بڑا اور چمکدار ہوتا ہوا۔ سب سے پہلے اس پر ڈرائیور کی نظر پڑی۔ اس نے آنکھیں سکوڑ کر دور افق پر طلوعِ آفتاب کی طرح اگتے آگ کے ایک دائرے کو دیکھا۔ اس کی تجربہ کار آنکھوں میں ایک کوندھ سی لپکی اور اس نے پوری توجہ سے ایک دائرے کو دو میں اور روشنی کے چھوٹے ہالے کو بڑے میں تبدیل ہوتے دیکھا۔ اس کی حرکتوں سے باب الدین کا دھیان بھی اس روشنی کے مخرج پر گیا جو اَب واضح ہوتا جا رہا تھا کہ کسی بڑی گاڑی کی ہیڈ لائٹ سے پیدا ہو رہی تھی۔ بچ سکنے کا امکان لگ رہا ہے، آگے کی طرف جھکے جھکے باب الدین نے اپنے درد پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔

ڈرائیور نے دروازے سے منھ باہر نکال کر چلاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو الرٹ کرنے کی کوشش کی۔ باہر ماحول میں اس قدر ہیجان گھلا ہوا تھا کہ گولیوں اور انسانی چیخ پکار میں کوئی بھی ڈرائیور کو نہیں سن پا رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو للکارتے ہوئے ماں

بہن کی گالیاں دیں اور جب اس کا اثر نہیں دکھائی دیا تو اپنی گاڑی کا ہارن بجانا شروع کر دیا، پہلے دھیمے دھیمے، پھر تیز تیز۔ جیسے جیسے سامنے والی گاڑی قریب آتی گئی گھبراہٹ میں ہارن کی آواز بڑھتی گئی۔ لیکن جب تک وہ سنبھلتے، سامنے سے آنے والی گاڑی اتنے قریب آ گئی تھی کہ اس کی ہیڈ لائٹ کے دونوں گولے جڑ کر ایک ہو گئے تھے اور ان سے اپجی روشنی کی چادر نے نہر، اس کی پٹری، پانی میں پورے یا آدھے ڈوبے انسانی جسموں اور خاکی قاتلوں کو ان کے ہتھیاروں کے ساتھ اپنی آغوش میں لپیٹ لیا تھا۔

یہ دودھ کی گاڑی تھی جو شاید بغل کے کسی گاؤں سے دودھ جمع کر کے لوٹ رہی تھی۔ روشنی نے رات کا طلسم تار تار کر دیا تھا۔ دنیا بھر میں قاتل اندھیرا پسند کرتے ہیں۔ روشنی ان کے اندر خوف بھر دیتی ہے۔ یہاں بھی قاتل روشنی سے ڈر گئے اور ان میں سے دو تین اپنی رائفلیں تانے ہوئے سامنے والی گاڑی کی طرف دوڑے۔ ٹرک کے پچھلے حصے میں کھڑے باب الدین کو جتنا کچھ نظر آیا اس سے یہ سمجھ میں آ گیا کہ گالیوں اور رائفلوں کی مدد سے وہ اگلی گاڑی کے ڈرائیور کو اپنی ہیڈ لائٹیں بجھانے کے لیے کہہ رہے تھے۔ گھبرائے ہوئے اس ڈرائیور نے گالیوں کی اچھی خاصی برسات اور رائفلوں کے دو چار بٹ جھیلنے کے بعد روشنیاں بجھا دیں۔ ایک بار پھر پورا علاقہ اندھیرے کی آغوش میں ڈوب گیا۔

ٹرک کے پچھلے حصے میں کھڑے کھڑے، جھریوں میں سے باب الدین جو کچھ دیکھ یا سمجھ پایا، اس کے مطابق باہر کھڑے جوانوں نے آپس میں تھوڑی دیر مشورہ کیا اور ان میں سے پھر کچھ سامنے والی گاڑی کی طرف لپکے۔ انھوں نے سخت لہجے میں جو کچھ کہا اس کے نتیجے میں اس گاڑی کے ڈرائیور نے ہیڈ لائٹ جلائے بغیر اپنی گاڑی کو پیچھے کرنا شروع کیا اور پی اے سی کے ڈرائیور نے بھی اسی اندھیرے میں دھیرے دھیرے اپنی گاڑی آگے بڑھائی۔ تھوڑا اچل کر دونوں گاڑیاں رک گئیں۔ جہاں یہ رکیں وہاں پٹری تھوڑی چوڑی تھی اور ان کے رکنے کی بھی یہی وجہ تھی۔ پی اے سی کے ٹرک کی ہیڈ لائٹیں جلیں، انجن کی گڑگڑاہٹ کچھ تیز ہوئی اور اس کے ڈرائیور نے گاڑی بیک کی اور دودھ کے ٹینکر

سے لگ بھگ ٹکراتے ہوئے اپنا ٹرک تیز رفتار سے نیچے کچی زمین پر اتارا، پوری طاقت سے بریک مارا اور پھر اسی تیزی سے بیک کیا اور تھوڑی کوشش سے ٹرک کا منھ آنے والی سمت میں ہوگیا۔ اس افراتفری میں باب الدین کے زخم پر بھی اگل بغل کھڑے لوگوں کی رگڑ لگتی رہی اور وہ درد سے دہرا ہو ہو کر اپنا توازن بنائے رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

نیچے کھڑے لوگ لگ بھگ دوڑتے ہوئے ٹرک پر اچھل اچھل کر چڑھ گئے اور ٹرک تیزی سے مین روڈ کی طرف لپکا۔ میرٹھ سے چلتے وقت سوار ہوئے لوگوں میں سے کافی لوگ پیچھے چھوٹ گئے، اس لیے اندر بھیڑ کم ہوگئی تھی۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہوا کہ اس اوبڑ کھابڑ زمین پر تیز رفتار سے دوڑتے ٹرک میں خالی ہو چکی جگہ کی وجہ سے اپنا توازن بنائے رکھنا مشکل ہوگیا تھا۔ ہر جھٹکے کے ساتھ لوگ ایک دوسرے پر گر گر پڑتے۔ ہر ایسے جھٹکے سے گرتے سنبھلتے اور درد سے بلبلاتے ہوئے باب الدین کو آس پاس سے آتی کراہوں سے سمجھ میں آگیا کہ ٹرک میں اس کے علاوہ اور لوگ بھی ہیں جو زخمی ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں قاتل ٹرک سے نیچے نہیں اتار پائے تھے اور جب چڑھ کر انھوں نے اندر فائر جھونکا تو یہ گھائل ہوگئے تھے۔ باب الدین کو اچانک پتا چلا کہ ان کے بیچ ایک سپاہی بھی زخمی ہوگیا ہے۔ شاید افراتفری میں اسے بھی گولی لگ گئی تھی۔

ٹرک تیزی سے شاہراہ تک آیا اور جیسے ہی ٹی جنکشن آیا، ڈرائیور نے رفتار کم کیے بغیر اسے غازی آباد کی طرف موڑ دیا۔ اندر گھائلوں کی چیخیں نکل گئیں۔ لوگ اپنا توازن بنائے رکھنے کی کوشش کرنے کے باوجود ایک دوسرے پر گر گر پڑ رہے تھے۔ ٹرک بدحواسی کے سے عالم میں بھاگا چلا جا رہا تھا۔ دہلی سے میرٹھ ہو کر دہرادون، مسوری جانے والی سڑک کا یہ حصہ مئی کی گرم راتوں میں عموماً کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے۔ لیکن 22 مئی 1987 کو حالات قدرے مختلف تھے۔ دہلی کی طرف سے اکا دکا گاڑیاں ہی آرہی تھیں۔ ظاہر تھا کہ میرٹھ میں لگے کرفیو کا اثر سڑک پر بھی نظر آرہا تھا اور صرف مقامی ٹریفک ہی سڑک پر تھا، اور وہ بھی معمول سے کم۔

میرٹھ میں جو کچھ ان دنوں پیش آ رہا تھا اس کا سیدھا اثر آس پاس کے ضلعوں پر بھی پڑ رہا تھا۔ خاص طور سے غازی آباد تو جوالامکھی کے دہانے پر بیٹھا تھا۔ چاروں طرف افواہیں ہی افواہیں تھیں۔ لگتا تھا کہ سڑک پر لوگ صرف مجبوری میں ہی آئے تھے۔ ایسے میں اس خالی سڑک پر یہ غیر فطری نہیں تھا کہ تیز رفتار سے دوڑتے اس ٹرک کے پچھلے حصے میں کھڑے لوگوں کی چیخ پکار یا انھیں کنٹرول کرنے کے لیے قاتلوں کی گالیوں بھری تیز آواز میں ڈانٹ ڈپٹ پر سڑک چلتوں کا دھیان نہیں گیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کا دھیان گیا بھی ہو تو پی اے سی کی گاڑی دیکھ کر اسے کسی کارروائی کی ضرورت نہ محسوس ہوئی ہو۔

میرٹھ تراہے پر ٹرک تیزی سے داہنی طرف مڑا اور پوری رفتار سے ہنڈن ندی کی طرف لپکا۔ ندی پار کر کے مشہورِ زمانہ رَم 'اولڈ مانک' بنانے والی فیکٹری موہن میکنس کے سامنے سے گزرتے وقت ٹرک کچھ دھیما ہوا، پیچھے سوار لوگوں کی چیخ پکار تیز ہوئی لیکن کچھ بھی ایسا نہیں ہوا جو اس کی رفتار کو پوری طرح تھام سکے۔ ٹرک آگے بڑھ کر پھر بائیں مڑا اور تب تک ایک ہی رفتار سے دوڑتا رہا جب تک کہ وہ اس پگڈنڈی پر نہیں مڑ گیا جو مکن پور گاؤں کی طرف جاتی تھی۔

یہ پگڈنڈی بھی پچھلی والی کھڑنجے کی سڑک جیسی ہی تھی، اوبڑ کھابڑ اور چلتے سے ٹرک اور اس کے مسافروں کے جسموں کے انجر پنجر ہلا دینے والی۔ مڑتے ہی اندر کھڑے لوگوں نے اونچے سر میں چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اس کے پس پشت بری طرح سے ہلتے ہوئے ٹرک کی وجہ سے دکھنے والے زخم تو تھے ہی، ان کی چھٹی حس کی دی ہوئی یہ وارننگ بھی تھی کہ اسی طرح کے انجان سناٹے کی طرف جانے والا پتھریلا کنکریلا راستہ انھیں موت کے منھ تک لے کر گیا تھا۔ آج اس علاقے میں کنکریٹ کے گھنے جنگل کھڑے ہیں، لیکن 1987 میں وہاں کچھ نہیں تھا۔ سڑک کے ایک طرف لنک روڈ انڈسٹریل ایریا تھا جس کے زیادہ تر کارخانے بیمار پڑے تھے اور دوسری طرف مکن پور گاؤں کی بنجر دھرتی تھی جو غازی آباد دہلی کو جوڑنے والے لنک روڈ پر سے گزرنے والوں کو ایک بھورے بنجر

میدان کی طرح نظر آتی تھی۔ اسی بنجر زمین کو چیرتی ہوئی یہ پگڈنڈی تھی جو ایک نہر کو پار کرتے ہوئے مکن پور کی آبادی تک جاتی تھی۔

نہر پر آکر ٹرک رک گیا۔ ایک بار پھر پرانی کہانی دوہرائی گئی۔ ٹرک سے کچھ لوگ باہر کودے۔ انھوں نے ٹرک کا پچھلا تختہ کھول کر نیچے گرادیا۔ ایک بار پھر کڑکتی آواز میں لوگوں کو نیچے اترنے کا حکم دیا گیا لیکن اس بار کوئی نیچے نہیں اترا۔ لوگوں نے اندر دبکنے کی کوشش کی۔ وہ ایک لمحہ کے لیے سہم کر چپ ضرور ہوئے لیکن لگ بھگ ایک ساتھ ہی اونچے سروں میں انھوں نے رونا چلانا شروع کردیا۔ قاتل جو اس بار کچھ زیادہ ہی جلدی میں تھے، چیخ پکار سے مزید فعال ہوگئے۔ اوپر موجود خاکیوں میں سے دو تین نے ایک شکار کو دبوچا اور ہاتھ پیر پھینکتے اور دم بھر مزاحمت کرتے ہوئے آدمی کو نیچے پھینک دیا۔ اس کے نیچے گرتے ہی ایک بندوق گرجی، تیز چیخ گونجی اور ان کے شور سے اُمس بھری شانت ہوا کا سناٹا ٹوٹ گیا۔ ویسے ہی ہوا میں اچھال کر پھینکے گئے انسانی جسم نے گرتے ہوئے نہر کے لگ بھگ ٹھہرے ہوئے پانی کو جھکجھور کر متھ دیا۔

اس کے بعد اوپر کھڑے لوگوں کی چیخوں اور اوپر نیچے موجود قاتلوں کی گالی بھری للکاروں کے درمیان، پوری مزاحمت کے باوجود لوگ نیچے پھینکے جاتے رہے، پگھلے شیشے اور بارود کی گندھ ہوا میں تیرتی رہی اور نویڈا ہوتے ہوئے دہلی جانے کو تیار اس نہر کا ٹھہرا ہوا پانی بار بار کانپتا رہا۔ درد اور خوف سے مروڑ کھاتا ایک جسم بے ڈھنگے طریقے سے پانی کی سطح پر گرتا اور ٹوٹتے پانی کا دائرہ بناتے ہوئے غڑاپ سے نیچے چلا جاتا۔ جب تک باب الدین کی باری آئی، وہ تھک چکے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ صرف فرض ادائیگی کر رہے ہیں۔ دو مضبوط ہاتھوں نے اس کی کمر کو کس کے پکڑا اور اسے نیچے پھینک دیا۔ زمین پر گرنے سے پہلے، ہوا میں ہی ایک بار پھر پگھلا ہوا شیشہ اس کے جسم میں گھسا۔ اسے دو گولیاں لگی تھیں، پہلی بائیں کانکھ کے نیچے پیٹھ کی طرف اور دوسری سینے پر داہنی طرف۔ ایسا لگتا تھا کی ان دونوں جگہوں پر گولی اس کے مانس کو چیرتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ وہ ایسی

جگہ گرا تھا جہاں سرکنڈے کی گھنی جھاڑیاں تھیں اور جس کے متعلق اس اندھیرے میں یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ پانی ہے یا ساحل۔ گرتے ہی باب الدین نے محسوس کر لیا کہ اس کا نچلا دھڑ پانی میں اور جسم کا اوپری حصہ سرکنڈوں کے بیچ جا اٹکا ہے۔ اسے دو گولیاں ماری گئیں تھیں اور وہ زندہ تھا۔ 22/23 مئی 1987 کی اس رات میں، چاروں طرف سے خود کو گھیر کر بیٹھے لوگوں کو یہ واقعہ سناتے وقت وہ بار بار اللہ کا کرم ہے، اللہ کا کرم ہے، کہہ کر اپنے بچنے کو معنی پہناتا رہا۔

ایک بات زمین پر گرتے ہی باب الدین کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ اگر زندہ رہنا ہے تو قاتلوں کو اپنی موت کا یقین دلانا ہوگا اور اس نے یہی کیا بھی۔ اپنا کام ختم کرنے کے بعد قاتلوں نے اس گھپ اندھیرے میں طرح طرح سے یقین کرنے کی کوشش کی کہ کوئی زندہ تو نہیں بچ گیا ہے۔ ان کے پاس ایک ٹارچ تھی اور اسے جلا کر سرکنڈے کے اس سنجال میں زندگی کے نشان تلاش کیے گئے، جہاں کہیں کوئی حرکت محسوس ہوئی ادھر فائر جھونک دیا گیا، باہر زمین پر پڑے جسموں کو بوٹوں کی ٹھوکروں سے تولا گیا۔ ساکت، سانس روکے باب الدین نے اپنے چہرے پر روشنی کی تپش محسوس کی لیکن اس کا ناٹک کام آ گیا اور اسے مردہ مان لیا گیا۔

باب الدین کے لیے وقت ٹھہر گیا تھا، اسے کچھ یاد نہیں کہ وہ کتنی دیر تک دَم ساد ھے ویسے ہی پڑا رہا۔ آنکھیں بند کیے کیے اس نے ٹرک کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی، اس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں پل بھر کے لیے پوری نہر کو روشن ہوتا محسوس کیا اور پھر دھیرے دھیرے چھاتے ہوئے اندھیرے میں اپنی آنکھیں کھولیں۔ آس پاس بھیانک سناٹا پسرا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں کھولتا بند کرتا رہا اور آس پاس جو کچھ تھا اسے محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ خوف اسے ہلنے ڈلنے سے روکتا تھا اور ذرا سا کھٹکا ہوتے ہی اس کا جسم بے حس و حرکت ہو جاتا تھا۔ اسی لیے جب ہم پہنچے تو کافی دیر لگ گئی اسے یہ یقین دلانے میں کہ ہم نے خاکی ضرور پہن رکھی ہے لیکن ہم پہلے والوں سے مختلف ہیں۔ باب الدین

نے مکن پور پہنچنے سے پہلے جس نہر کا ذکر کیا تھا اس کی شناخت کرنے میں ہمیں دیر نہیں لگی۔ ہم میں سے کئی لوگ میرٹھ غازی آباد مارگ پر اکثر سفر کرتے تھے۔ خود میں اور ضلع مجسٹریٹ لگ بھگ ہر دوسرے تیسرے دن مودی نگر یا میرٹھ جاتے رہتے تھے، چنانچہ اس کے بیان سے یہ اندازہ لگانے میں ہمیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ یہاں آنے سے پہلے پی اے سی کا ٹرک مرادنگر کے پاس گنگ نہر پر مڑا تھا۔ یہ نہر میرٹھ سے غازی آباد آتے وقت، مودی نگر پار کرتے ہی، مرادنگر قصبے کے شروع ہونے سے پہلے سڑک کو کاٹتی ہوئی بہتی تھی۔ میں نے فوراً لنک روڈ تھانے کے وایرلیس سیٹ سے مرادنگر تھانے کے تھانیدار راجندر سنگھ بھگور سے بات کی۔ ہمارا اندازہ صحیح نکلا۔ پچھلا واقعہ اسی طرح ہوا تھا اور نہر کی طرف سے آتی ہوئی فائرنگ کی آواز سن کر وہاں پہنچے پولیس عملے کو وہی سب دیکھنے کو ملا تھا جیسا باب الدین نے ہمیں بتایا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ باب الدین کو نہیں پتا تھا کہ وہاں نہر سے تین لوگ زندہ نکلے تھے اور وہ تھانہ مرادنگر پر موجود تھے۔

❁ ❁ ❁

3

کہیں نہیں ہے، کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ

ٹیلیفون ملتے ہی جو رِنگ ٹون سنائی دی، وہ تھی: چک دے انڈیا۔ اس میں کوئی عجوبہ نہیں تھا۔ ان دنوں ہر تیسری چوتھی رنگ ٹون یہی ہوتی تھی۔ خاص طور سے نوجوانوں کے فون کی۔ متوسط طبقہ سپنوں کا سب سے بڑا خریدار ہوتا ہے اور 'چک دے انڈیا' نے اس کے سامنے ایک بڑا لبھاونا سپنا بیچا تھا۔ آبادی کے ایک بڑے حصے کے خطِ غریبی کے نیچے جینے کے باوجود انڈیا یعنی بھارت جیت سکتا ہے۔ لبرلائیزیشن کے دور میں جیتنے کا مطلب ہے بھارتیہ آئیٹی کمپنیوں کا دنیا بھر میں چھا جانا، کچھ لاکھ لڑکے، لڑکیوں کا ایسے روزگار حاصل کر لینا جن کا کچھ برس پہلے تک انھوں نے نام بھی نہیں سنا تھا یا پھر فوربس کی دنیا کے سب سے امیر 100 لوگوں کی فہرست میں کچھ بھارتیوں کا شمار ہو جانا۔

مجھے اس رنگ ٹون کو سن کر تھوڑا سا اچنبھا ہوا۔ یہ رنگ ٹون چالیس سال کے پیٹے میں پہنچے ادھیڑ عمر کے ایک ایسے شخص کے ٹیلیفون سے آ رہی تھی جو بیس سال پہلے بھارتیہ راجیہ کے ذریعے قتل ہوتے ہوتے بچا تھا۔ اس کے دل میں تو حکومت ہند کے تئیں نفرت اور غصہ بھرا ہونا چاہیے تھا پھر کیسے یہ چک دے انڈیا کی خواہش کر رہا تھا؟ اس شخص کا نام

ذوالفقار ناصر تھا اور 16 نومبر 2007 کو مسوری سے دہلی کی طرف لوٹتے وقت راستے میں رک کر اس سے ملنے کا میرا ارادہ تھا۔ میں ہاشم پورہ سے وابستہ تمام لوگوں سے مل چکا تھا لیکن ابھی تک ذوالفقار ناصر سے میری لمبی ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔ ہاشم پورہ واردات کی بیسویں سالگرہ کے موقعے پر جب میرٹھ سے کچھ عورتیں اور مرد لکھنؤ پہنچے تو ان میں ذوالفقار ناصر بھی تھا اور مادھوی کگر یجا کے گھر پر میری اس سے ہلکی پھلکی ملاقات ہوئی تھی، تبھی مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ نہروں سے بچ کر نکلے لوگوں میں سب سے زیادہ مرتکز ذہن کا اور دنیا دار ذوالفقار ہی ہے۔ لکھنؤ میں بھیڑ بھاڑ اور اس گروہ کے مصروف پروگراموں میں تفصیل سے بات کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے مجھے الگ سے اس سے باتیں کرنی ہوں گی۔ میں مسوری میں واقع 'لال بہادر شاستری راشٹریہ پرشاسنک اکادمی' میں فرقہ وارانہ تشدد کے دوران حکومت ہند کے رول پر مقتدر شہریوں اور فوجی افسران سے خطاب کرنے گیا تھا۔ اپنے بھاشن کے دوران ہاشم پورہ کا ذکر کرتے ہوئے یکا یک لگا کہ مجھے اسی سفر میں ذوالفقار ناصر سے بھی مل لینا چاہیے۔ حالانکہ اس دن وہ مصروف تھا اور اگلے دن ٹرین میں ریزرویشن کے مسئلے کی وجہ سے اس سفر میں تو ملاقات نہیں ہو پائی لیکن ٹیلیفون پر جو لمبی بات چیت ہوئی اس سے میں اسے یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گیا کہ میرا اس سے ملنا کتنا ضروری ہے اور اسے میرے لیے وقت نکالنا ہی پڑے گا۔

بعد کے دنوں میں میری اس سے کئی ملاقاتیں ہوئیں، کچھ چھوٹی، کچھ لمبی۔ ہر بار میں اس کی یادداشت اور بیان کرنے کی قوت سے متاثر ہوا۔ مجھولے قد اور تنومند بدن کا مالک یہ شخص ایک دنیا دار اور کامیاب بیوپاری تھا جس نے موت کا اتنے قریب سے سامنا کیا تھا کہ خود اس کے الفاظ میں وہ "حادثے کے کئی برس بعد بھی گہری نیند میں بھی پسینے سے تر بتر جاگ اٹھتا اور ادھ کھلی آنکھوں سے پی اے سی، لاشوں اور بندوقوں کے سپنے دیکھا کرتا تھا۔" اس ہتیا کانڈ میں بچ نکلنے والے دوسرے لوگوں سے وہ ان معنوں میں زیادہ خوش قسمت تھا کہ اس کی ملاقات اس وقت کے ایم پی اور مسلم مسائل پر کام

کرنے والے سماجی کارکن، سید شہاب الدین سے نہر سے بچ نکلنے کے فوراً بعد ہوگئی تھی اور اسے نہ صرف ان کے گھر میں پناہ اور علاج کی سہولت ملی بلکہ ان کے سفارشی خط کے سہارے اس کا داخلہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک تکنیکی کورس میں ہوگیا تھا اور وہاں کی تعلیم اور اپنے خاندانی پس منظر کی وجہ سے اس نے اپنے خاندانی دھندھے میں خود کو ایک کامیاب بیوپاری کی طرح جما لیا۔ کامیابی نے اسے اس قدر مصروف بنا دیا ہے کہ کئی کئی بار کوشش کرنے کے بعد ہی وہ مجھے بات چیت کرنے کے لیے وقت دے پاتا ہے۔

ایسے ہی ایک موقعے پر جب میں نے اس سے یہ وعدہ کرا لیا کہ وہ پورا دن مجھے دے گا میں اسے لے کر مرادنگر کی طرف بڑھا۔ تاریخ ٹھیک 22 مئی یعنی موت کے منھ سے نکلنے کی برسی! سنہ 2011 میں، چوبیس سال بعد ذوالفقار ناصر نے انھی راستوں پر ایک بار پھر سفر کیا جہاں جہاں سے اسے لے کر اکتالیسویں بٹالین پی اے سی کا ٹرک URU-1493 گذرا تھا۔ ٹرک پر بیٹھنے والوں کو احساس تھا کہ وہ حراست میں لیے جانے کے بعد تھانہ سول لائنز یا جیل لے جائے جائیں گے۔ یہ آخری ٹرک تھا جس میں ان چالیس پینتالیس لوگوں کو ٹھونس دیا گیا تھا جو بھیڑ میں سے چھانٹ کر الگ بٹھا دیے گئے تھے۔ انھیں الگ کرنے کی ایک ہی بنیاد سمجھ میں آ رہی تھی کہ یہ سبھی کم عمر، ہٹے کٹے جوان تھے۔ اس الگ گروہ کے ساتھ سڑک کے کنارے نیم تاریکی میں اونگھتے پرانے چھتنار نیم کے درخت کے نیچے، سڑک کی پٹری پر، زمین پر بیٹھے ذوالفقار نے دو سے زیادہ گھنٹوں کے دوران گھروں سے نکالے گئے لوگوں کو دھیرے دھیرے چھنٹتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے کئی کو جو زیادہ بوڑھے تھے یا بیمار لگ رہے تھے، گھر جانے کے لیے کہہ دیا گیا۔ ایسے لوگ تیزی سے اپنی اپنی گلیوں کی طرف لپکے۔ جن کے عزیز واقربا پیچھے چھوٹ رہے تھے وہ ضرور رک رک کر خوف زدہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے لیکن پیچھے سے کوئی پولیس والا ہُر یاتا اور وہ گالی کھا کر آگے بھاگتے۔ ان میں ذوالفقار کے دادا عبدالباری بھی تھے۔ دادا پوتے کی نگاہیں آپس میں ٹکرائیں تو ذوالفقار کی رُلائی چھوٹ

گئی۔ پتا نہیں دادا کا دھیان اس کے آنسوؤں پر گیا بھی یا نہیں، ذوالفقار نے ایک سپاہی کو ان کی بغل میں لاٹھی پٹکتے اور زور سے ان پر چلاتے دیکھا۔ دادا کے جانے کے بعد اس کا دل اور زور زور سے رونے کو چاہنے لگا۔ اس کے ساتھ پکڑ کر لائے گئے دو چاچا محمد اقبال اور محمد اشفاق کے ساتھ اس کے باپ عبدالجبار کو پہلے ہی دوسرے ٹرکوں پر بٹھا کر بھیجا جا چکا تھا۔ سڑک کی پٹری پر ایک گروہ میں بیٹھا ذوالفقار، دھیرے دھیرے زمین پر اتری اس اُمس بھری اندھیری رات میں خود کو پوری طرح تنہا محسوس کر رہا تھا۔ شاید وہاں موجود دوسرے نوجوانوں کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔

جب سول لائنز تھانے پر تھوڑی دیر رک کر ٹرک آگے بڑھا تو انھیں لگا کہ وہ جیل لے جائے جا رہے ہیں۔ باہر سڑکیں پوری طرح ویران تھیں، انھیں ٹرک کے فرش پر اکڑوں بیٹھنے کے لیے مجبور کیا گیا تھا، اور ٹرک کے پچھلے حصے کو آدھا ڈھکنے والے لوہے اور لکڑی کے پٹرے پر کمر ٹکائے سپاہیوں کو بیدھ کر باہر دیکھ پانا کافی حد تک ناممکن تھا۔ لیکن اکڑوں بیٹھا ہر شخص اپنے فطری انسانی اشتیاق سے باہر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر کوئی ذرا بھی سر اٹھاتا تو اس کے سر پر مضبوط ہاتھوں کی چپت یا بندوق کا کندا پڑتا۔ لیکن اس کے بعد بھی باہر کی دنیا اتنی جانی پہچانی تھی کہ جو تھوڑی بہت جھلک انھیں دیکھنے کو ملی اس سے انھیں پیچھے چھوٹنے والے علاقوں کا کچھ کچھ احساس ہو رہا تھا۔ بیگم پل سے ہوتا ہوا ٹرک جب دہلی روڈ پر مڑا تو انھیں تعجب ضرور ہوا لیکن جو کچھ ہونے والا تھا اس کا اندازہ وہ ٹرک میں گمبھیر چہروں اور سرگوشیوں میں بات کرنے والے اپنے محافظوں کو دیکھ کر بھی نہیں لگا سکے۔

اس واقعہ کو دہلی کے ایڈیشنل سیشن جج کے سامنے 8 اگست 2006 کو یاد کرتے ہوئے ذوالفقار ناصر نے بتایا:

> ''22 مئی 1987، جمعے کے دن میں شام چھ بجے کے آس پاس اپنے گھر کی چھت پر نماز پڑھ رہا تھا تبھی کچھ فوجی وہاں آئے۔ فوجی مجھے، میرے

والد، دو چاچاؤں اور بابا کو گلی کے باہر سڑک پر لے گئے۔ وہاں پہلے سے بیٹھے چار پانچ سو لوگوں کے بیچ ہمیں بھی بٹھا دیا گیا... پی اے سی نے محلے کے لوگوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا، ایک طرف نوجوان تھے اور دوسرے گروہ میں بوڑھے اور بچے۔ بوڑھے، بچوں کو چھوڑ کر میرے والد اور چاچاؤں سمیت لوگوں کو پی اے سی کے ٹرکوں میں بھر کر بھیج دیا گیا۔ آخر میں بچے چالیس پینتالیس ہٹے کٹے لوگوں کو، جن میں میں بھی شریک تھا، وہاں کھڑے پی اے سی کے آخری ٹرک پر بٹھا دیا گیا۔ ٹرک پر ہمیں گھیر کر پی اے سی کے لوگ اس طرح کھڑے ہو گئے تھے کہ ہم سب باہر سے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہمیں اپنے سر جھکا کر بیٹھنے کی ہدایت دی گئی اور جس کسی نے سر اٹھانے کی کوشش کی اسے بندوقوں کے بٹ اور گالیوں سے نوازا گیا۔ جتنا کچھ باہر سے میں دیکھ سکا اس سے یہ واضح ہو گیا کہ ہمارا ٹرک دہلی جانے والی سڑک پر تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ٹرک مرادنگر میں گنگ نہر کی پٹری کی طرف مڑا۔ نہر کی پٹری پر لگ بھگ ایک ڈیڑھ کلومیٹر چلنے کے بعد ٹرک رکا۔"

اسی نہر کی پٹری پر بیس برس بعد 22 مئی 2011 کو اندازے سے ذوالفقار ناصر نے ٹیکسی کے ڈرائیور کو رکنے کے لیے کہا۔ میں پچھلی سیٹ سے نیچے اترا لیکن اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ذوالفقار کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ نیچے اتر کر میں نے دیکھا کہ نہر کی پٹری کولتار کی ایک پکی سڑک میں تبدیل ہو چکی ہے۔ جہاں ہم رکے وہاں آم کے دو پرانے درخت کھڑے تھے۔ شاید انھی کو دیکھ کر ذوالفقار نے جگہ پہچانی تھی۔ لیکن وہ گاڑی سے کیوں نہیں اترا؟ میں نے اس کے چہرے پر اچٹتی نظر ڈال کر سبب تلاشنے کی کوشش کی۔ اپنے مقتل پر آ کر وہ مضطرب سا لگ رہا تھا۔ میں نے چپ چاپ کھڑے ہو کر اسے اپنے جذبات پر قابو پانے کا موقع دیا اور تیز رفتار سے بہتے ہوئے اس پانی کو نہارتا رہا جس میں بیس سال پہلے تازہ زخم لیے بیسیوں لاشیں بہی ہوں گی۔ تھوڑی دیر بعد ذوالفقار ناصر بھی نیچے اتر آیا۔

22 مئی 1987 کے بعد ناصر کا جائے واردات کا یہ دوسرا سفر تھا۔ اس سے پہلے صرف ایک بار اور وہ یہاں آیا تھا۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ نارمل ہوگیا اور اس نے سدھے ہوئے ڈھنگ سے اپنی آپ بیتی سنانی شروع کی۔

ٹرک کے رکتے ہی پیچھے کھڑے سپاہیوں میں سے کچھ نیچے کودے۔ سب سے پہلے انھوں نے لکڑی اور لوہے کا وہ پٹرا نیچے گرادیا جو زنجیروں اور کنڈوں سے اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ ٹرک کا پچھلا حصہ ایک بند کمرے کا سا احساس کراتا تھا اور جس کے نیچے گرتے ہی ایسا لگا کہ جیسے کمرے کی ایک دیوار ہٹادی گئی ہو۔ نیچے سے کڑکتی آواز میں باہر کودنے کا حکم آیا۔ سب سے پہلے یاسین کودا۔ پتا نہیں یہ حکم کی دہشت تھی یا کسی نے اسے اوپر سے نیچے دھکیل دیا تھا لیکن اس کے نیچے گرتے ہی گولی چلنے کی دہشت پیدا کرنے والی آواز آئی اور ناصر نے اسے زمین پر گرتے اور اس کے بعد دو لوگوں کے ذریعے ہاتھ پیر پکڑ کر ہوا میں جھلاتے ہوئے نہر میں پھینکے جاتے دیکھا۔ اس کے بعد کوئی آسانی سے باہر نہیں کودا۔ ٹرک پر موجود سپاہیوں نے اشرف نام کے دوسرے لڑکے کو اوپر سے نیچے دھکیل دیا۔ گرتے ہی اسے بھی گولی ماردی گئی اور نہر میں پھینک دیا گیا۔ ذوالفقار نے ٹرک کے اندر بھیڑ میں دھنسنے کی کوشش کی لیکن دو مضبوط ہاتھوں نے کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے گھسیٹا اور اپنے اگل بغل کے لوگوں کو پکڑ کر نیچے پھینکے جانے سے روکنے کی ناکام کوشش کرتا ہوا وہ بھی زمین پر جاگرا۔ زمین پر گرتے ہی ایک رائفل گرجی اور اس کی کانکھ میں گھسی گولی سینے کے پاس مانس چیرتی ہوئی پچھلے حصے سے باہر نکل گئی۔ سہج سمجھ داری نے اسے بتادیا کہ بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ قاتلوں کو اپنی موت کا یقین دلا دیا جائے۔ انھوں نے اسے اٹھا کر نہر میں پھینک دیا۔ بیچ نہر کے تیز بہاؤ میں نہ گر کر وہ کنارے اُگی گھنی جھاڑیوں کے پاس اچھلے اور دھیمی رفتار سے بہتے پانی میں گرا اور تھوڑی دور بہنے کے بعد ایک جھاڑی میں اٹک کر رک گیا۔ اس کے لیے وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ کانکھ کے نیچے کا زخم ابھی تازہ تھا اور درد قابل برداشت۔ زخم سے ٹپکتا ہوا خون آس پاس کے پانی میں ہلکا لال

دائرہ بنا رہا تھا جو بہاؤ کی وجہ سے پوری طرح بننے سے پہلے ہی ٹوٹ ٹوٹ رہا تھا۔ وہ بے حرکت، مردے کی مانند پڑا رہا، لوگوں کے چیخنے چلانے، ہتیاروں کی للکار اور گالیاں اور گولیوں کی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکراتی رہیں اور اسے سب کچھ بہت دور واقع ہوتا سا لگتا رہا۔

اچانک مخالف سمت سے روشنی کا ایک دائرہ آیا اور نہر کی پٹری، جھاڑ جھنکاڑ اور بہتا پانی دودھیا رنگ ہو اٹھے۔ آتے ہوئے شور شرابے سے اسے صرف یہ احساس ہوا کہ سامنے سے کوئی دوسری گاڑی آ گئی ہے اور اس کی گاڑی پر سوار سپاہی گالی گلوج کر آنے والی گاڑی کے ڈرائیور سے ہیڈ لائٹس بجھانے کے لیے کہہ رہیں ہے۔ پھر اندھیرا چھا گیا۔ کچھ ہی پلوں میں اسے اپنے ٹرک کے انجن کی گھر گھراہٹ سنائی دی۔ ہیڈ لائٹ جلائے بغیر ٹرک کے آگے کی طرف بڑھنے کا احساس ہوا۔ کچھ ہی پلوں بعد پھر سے سارا علاقہ روشن ہوا اور ایک گاڑی چنگھاڑتی ہوئی نہر کی پٹری سے میرٹھ دہلی راج مارگ کی طرف لپکی۔ ایک بار پھر اندھیرا چھا گیا۔ جھاڑی سے لٹکے لٹکے ذوالفقار نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ جو گاڑی ابھی گزری ہے وہ انھیں لانے والا پی اے سی کا ٹرک تھا یا سامنے سے آنے والی دوسری گاڑی۔ یہ گتھی ابھی سلجھی بھی نہ تھی کہ ایک بار پھر علاقہ روشن ہوا۔ تیز رفتار سے کوئی دوسری گاڑی بھی اسی سمت میں گزری۔ مطلب کہ دونوں گاڑیاں وہاں سے جا چکی تھیں۔ اس کے بعد ایک لمبا سناٹا چھا گیا۔

اچانک اسے لگا کہ کوئی اسے چھو رہا ہے۔ اس کا پورا بدن کاٹھ کا ہو گیا۔ تو موت سے بچنے کی اس کی جدوجہد ختم ہو گئی اور قاتلوں نے اسے ڈھونڈ ہی لیا؟ وہ اپنی ساری حرکتیں روک کر آنکھیں موندے اس پل کا انتظار کرتا رہا جس میں پہلے ایک تیز آواز سنائی دے گی اور اس کے بعد وہ پگھلے شیشے کو اپنے جسم میں گھستے ہوئے محسوس کرے گا۔ ایک بار پھر کسی نے اس کا بدن تھپتھپایا اور اسے سرگوشی میں ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو اسے اپنے پہلو میں عارف لیٹا ہوا نظر آیا۔

عارف محلے کا ہی لڑکا تھا اور ٹرک پر اس کے ساتھ ہی چڑھایا گیا تھا۔ وہ کب پانی میں بہتا ہوا آ کر اس کے پاس ٹک گیا، ذوالفقار کو پتا ہی نہیں چلا۔ یہ تو تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ عارف کو کوئی چوٹ نہیں لگی تھی۔ جیسے ہی گولیاں چلنی شروع ہوئیں اس نے پی اے سی کے ٹرک سے کود کر بھاگنے کی کوشش کی تھی اور سیدھے نہر میں جا گرا تھا۔ اس کے بعد سے لگاتار بے حرکت پڑا رہ کر وہ ہتیاروں کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ عارف کی موجودگی سے ذوالفقار کو تھوڑی سی قوت ملی اور امید بندھی کہ وہ دونوں مل کر موت سے لڑ سکیں گے۔ حالانکہ پوری طرح سے خاموشی چھائی تھی پھر بھی خوف نے انھیں گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے سر اٹھانے سے روکے رکھا۔ اس نے عارف کو بھی بولنے سے روک دیا۔ سے بہت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا اور اگر ٹھنڈے ہو گئے اس کے زخم سے درد کی ٹیسیں نہ اٹھنے لگی ہوتیں اور جھاڑیوں کو پکڑے پکڑے ہاتھ دکھنے نہ لگے ہوتے تو شاید تھکن کا مارا ذوالفقار وہیں سو بھی جاتا۔ عارف زخمی تو نہیں تھا لیکن دن بھر کے روزے کی وجہ سے بھوک سے ٹوٹتے بدن اور جھاڑیوں سے لٹکے رہنے کے سبب درد کرتے کندھوں نے اسے مجبور کیا اور اس نے ذوالفقار کو نہر سے باہر نکلنے کے لیے تیار کر لیا۔ باہر نیم تاریکی میں نہر کی پٹری پر تین زخمی اور پڑے ہوئے تھے۔ ایک کو ذوالفقار نے پہچانا۔ ہاشم پورہ کا ہی قمر الدین تھا۔ باقی دو کو عارف یا وہ نہیں جانتے تھے۔

قمر الدین خون میں ڈوبا ہوا تھا اور بری طرح سے کراہ رہا تھا۔ ذوالفقار نے جھک کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ قمر الدین نے بھی اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھانے کی کوشش کی لیکن اس کے جسم میں اتنی طاقت نہیں بچی تھی کہ وہ سہارے سے بھی کھڑا ہو سکے۔ عارف اور اس نے اس کے دائیں بائیں بازوؤں کو پکڑ کر اسے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن اس کا زخمی جسم مردے کی مانند جھول گیا۔ اس کے زخموں سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے اور ذوالفقار اور عارف کے بھیگے کپڑوں پر لال رنگ کی چادر سی چھاتی جا رہی تھی۔

انھوں نے اسے لگ بھگ گھسیٹنا شروع کر دیا۔ وہ بری طرح کراہ رہا تھا اور اس اندھیری سیاہ رات میں بیچ بیچ میں اٹھتی اس کی چیخیں دور تک پھیلے سناٹے کو چیرتی ہوئی خلا میں جذب ہوتی جارہی تھیں۔ جائے واردات سے ڈیڑھ دو کلو میٹر دور میرٹھ دہلی راج مارگ تک پہنچنے میں انھیں جیسے یگ بیت گئے۔ ذوالفقار ناصر اپنا زخم بھول گیا تھا لیکن اس واقعہ کو میرے سامنے بیان کرتے وقت اسے اتنا واضح یاد تھا کہ ہر دس پندرہ قدم کے بعد ان کے ہاتھوں میں جھولتا ہوا قمرالدین کا جسم دھرتی پر ٹک جاتا اور وہ تھوڑی دیر ستانے کے بعد پھر پہلے جیسی ہی کوشش کرتے۔ بمشکل، کراہتے ہوئے قمرالدین کو وہ اٹھاتے اور گھسٹتے ہوئے آگے بڑھتے۔ وقت ان کے لیے تکلیف دہ ڈھنگ سے دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔ ذوالفقار کو یاد نہیں کہ انھیں اس ڈیڑھ دو کلو میٹر کا سفر طے کرنے میں کتنا وقت لگا، لیکن اتنا یاد ہے کہ جب وہ ٹی جنکشن پر پہنچے تو پیاس اور تھکن کے مارے وہ تینوں سڑک پر جیسے ڈھے پڑے۔ قمرالدین تکلیف سے ہانپ رہا تھا۔

آج تو وہاں پر ایک بڑا اڈھابا گنگ نہر ڈھابا کے نام سے موجود ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے، دن کے گیارہ بجنے والے تھے اور اس ڈھابے میں لگ بھگ 500 لوگ کھا پی رہے تھے۔ 22 مئی 1987 تک دہلی میرٹھ راج مارگ اتنا چوڑا نہیں ہوا تھا اور آج کے چوڑے پل سے مختلف ایک چھوٹی سی پلیا گنگ نہر پر تھی۔ ان دنوں اس گنگ نہر ڈھابے کی جگہ کئی چھوٹے چھوٹے ڈھابے اور چائے پان کی دوکانیں ہوا کرتی تھیں۔ قمرالدین کو انھوں نے پلیا کے سہارے زمین پر بٹھایا اور خود پلیا پر بیٹھ گئے۔ قمرالدین کی واضح کراہوں سے ذوالفقار کو لگا کہ وہ پانی مانگ رہا ہے۔ وہ خود بھی بری طرح سے پیاسا تھا۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں، تھوڑی دور پر ایک ڈھابے میں ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ لگتا تھا کہ دوکان بڑھانے کے بعد کچھ لوگ وہاں سو رہے تھے۔ اس نے قمرالدین کو عارف کے حوالے کیا اور ڈھابے کی طرف بڑھا۔ اسے کسی کو جگانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ڈھابے کے باہر اندھیرے میں دو لوگ کھڑے تھے جو شاید کچھ دیر پہلے آنے والی

گولیوں کی آوازوں سے جاگ گئے تھے، اور تھوڑی دور نہر پر کیا کچھ ہوا ہوگا یہ جاننے اور اب اپنی طرف بڑھتے ہوئے ذوالفقار کا مقصد بھانپنے کی کوشش کررہے تھے۔ خون سے لت پت ذوالفقار نے انھیں جو کچھ بتایا، اسے پتا نہیں وہ کتنا یا کیا کچھ سمجھے لیکن ان میں سے ایک اندر جا کر ایک گلاس لے آیا اور اسے ذوالفقار کو تھما کر انگلی سے تھوڑی دور واقع ہینڈ پمپ کی طرف اشارہ کیا۔ ذوالفقار نے آگے بڑھ کر گلاس میں پانی بھرا اور ایک گھونٹ میں ہی غٹاغٹ پی گیا۔ اس نے دوسری بار گلاس پھر بھرا اور گھائل قمرالدین کی طرف بڑھا۔ اس کے پیچھے پیچھے وہ دونوں بھی آئے۔ وہاں پہنچ کر تھوڑی دیر کے لیے وہ چکرایا، عارف کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ عارف کو کہیں چوٹ نہیں لگی تھی اور واضح تھا کہ گھائل قمرالدین کو چھوڑ کر وہ بھاگ گیا تھا۔

اس نے عارف کو چاروں طرف تلاشنے کی کوشش کی لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ ہاشم پورہ ہتیا کانڈ میں بچے ہوئے لوگوں میں عارف ایک ایسا شخص ہے جو بعد میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ نہ تو کسی پولیس ریکارڈ میں اس کا ذکر آیا اور نہ ہی کسی عدالت میں وہ پیش ہوا۔ ہاشم پورہ کے بچے ہوئے لوگ اگلے بیس برسوں تک آندولنوں اور میڈیا کے ذریعے خبروں میں آتے رہے لیکن عارف کبھی سامنے نہیں آیا۔ مجھے ہاشم پورہ میں پتا چلا کہ اس کا کھاتا پیتا خاندان اس واقعہ کے بعد ہاشم پورہ چھوڑ کر شہر میں کہیں اور جا کر بس گیا ہے اور ہاشم پورہ کو لے کر چلنے والے کسی بھی آندولن سے خود کو دور رکھتا ہے۔

ذوالفقار جب پانی لے کر قمرالدین کے پاس پہنچا، اس کی حالت اور خراب ہو چکی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے کراہ رہا تھا۔ ذوالفقار نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پلیا سے ٹک کر جھکی ہوئی اس کی گردن سیدھی کرنے کی کوشش کی اور گلاس اس کے منھ سے لگایا۔ قمرالدین شروع میں گٹک گٹک کر اور پھر تیزی کے ساتھ پانی پیتا رہا۔ بہت جلد گلاس خالی ہو گیا۔ جس طرح کھلے منھ اور خوف زدہ نظروں سے قمرالدین اسے دیکھ رہا تھا اس سے لگ رہا تھا جیسے ابھی اس کی پیاس بجھی نہیں، وہ اور پانی چاہتا تھا۔ ذوالفقار نے اپنے

پیچھے کھڑے دونوں اجنبیوں کو دیکھا۔ ان میں سے ایک گلاس لے کر پانی لینے چلا گیا۔ قمرالدین کی گردن رہ رہ کر لڑھک رہی تھی اور اسے اپنی گود میں سیدھا رکھنے کی کوشش کرنے میں ذوالفقار کو مشکل پیش آرہی تھی۔ لگتا تھا کہ جسم سے بہہ چکے خون نے دھیرے دھیرے اسے اتنا کمزور کردیا ہے کہ اب سہارا لے کر بھی وہ بیٹھ نہیں پارہا تھا۔

پیچھے کھڑا آدمی سب کچھ سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔ ذوالفقار نے جو کچھ اسے بتایا اس سے وہ کیا کچھ سمجھا یہ تو نہیں کہا جاسکتا لیکن اسے یہ ضرور پتا لگ گیا تھا کہ کچھ بہت سنگین واقع ہوا ہے اور اس کی اطلاع فوراً پولیس کو دینی چاہیے۔ اسی بیچ دوسرا آدمی گلاس میں پانی لے کر آگیا۔ ذوالفقار نے قمرالدین کو دوبارہ پانی پلانے کی کوشش کی لیکن اس بار مشکل سے ایک گھونٹ پانی اس کے حلق میں گیا ہوگا کہ اس کی گردن لڑھک گئی۔ بار بار کوشش کرنے کے بعد بھی وہ اپنی آنکھیں نہیں کھول پارہا تھا اور پانی اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے نیچے بہا جارہا تھا۔ پیچھے کھڑے دونوں آدمی کسی گمبھیر سوچ بچار میں مشغول تھے۔ یہ واضح تھا کہ وہ کسی لفڑے میں نہیں پڑنا چاہتے تھے اور جلدی سے جلدی پولیس تک یہ خبر پہنچانا چاہتے تھے۔ انھوں نے ذوالفقار کو وہیں رکنے کے لیے کہا اور یقین دلایا کہ وہ جلدی ہی پولیس کو لے کر لوٹیں گے اور انھیں علاج کے لیے اسپتال لے چلیں گے۔ ذوالفقار کو پتا نہیں تھا کہ تھانہ کہاں ہے۔ اس نے دونوں کو پہلے ڈھابے کی طرف اور پھر وہاں سے ایک سائیکل پر سوار ہوکر مخالف سمت میں جاتے ہوئے دیکھا۔

وہ پولیس کو لانے جارہے تھے، ذوالفقار ناصر نے اپنی پسلیوں میں ایک بار پھر دہشت بہتی محسوس کی۔ ابھی جن قاتلوں کے چنگل سے وہ بچ نکلا ہے وہ بھی تو خاکی پہنے ہوئے تھے۔ دوسرے خاکی والے کیا ان سے الگ ہوں گے؟ اگر وہ ان کے ہاتھ پڑا تو کیا وہ اسے چھوڑ دیں گے؟ اس نے چاروں طرف چھپنے کی جگہیں تلاش کیں۔ پلیا کے نیچے تیز رفتار سے پانی بہہ رہا تھا، سامنے تین چار گمٹیاں نظر آرہی تھیں اور دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے، جن میں گنے اور چری کی فصلیں کھڑی تھیں۔ اگر چھپنا تھا تو فوراً

ہی نکلنا پڑے گا۔ زخم سے خون کا بہنا کافی حد تک بند ہو چکا تھا پھر بھی درد رہ رہ کر ٹیسنے لگتا تھا۔ اس نے قمرالدین کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن اب وہ پوری طرح نڈھال ہو چکا تھا اور اسے اپنے اوپر لاد کر یا گھسیٹتے ہوئے بھاگنا ہوگا۔ آتے وقت تو عارف بھی تھا اور دونوں مل کر قمرالدین کا ایک ایک بازو اپنے کندھوں پر ڈالے اسے کچھ اٹھائے اور کچھ گھسیٹتے ہوئے یہاں تک لائے تھے۔ اب حالات ایک دم مختلف تھے، وہ اکیلا تھا اور زخموں سے نڈھال قمرالدین ایک قدم بھی چل نہیں سکتا تھا۔ اس نے اسے گھسیٹتے ہوئے کچھ دور تک چلنے کی کوشش کی لیکن چند قدموں بعد ہی تھک کر قمرالدین کو لیے لیے زمین پر گر پڑا۔ درد سے کراہتے قمرالدین کے منہ سے ایک چیخ سی نکلی اور بمشکل اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے جو دو تین جملے اس نے کہے ان سے یہ واضح ہو گیا کہ نیم بیہوشی کی حالت میں بھی جو کچھ ہو رہا تھا اسے وہ تھوڑا بہت سمجھ رہا تھا۔ اس نے ٹوٹتی آواز میں ذوالفقار کو بھاگ جانے کے لیے کہا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بچ نہیں پائے گا۔ بھور ہونے والی تھی اور آس پاس کی چیزیں صاف نظر آنے لگی تھیں۔ ذوالفقار کے لیے سوچنے کو بہت کچھ نہیں تھا، جو کچھ قمرالدین کہہ رہا تھا لگ بھگ اسی طرح کا تذبذب اس کے دل میں بھی پیدا ہو رہا تھا۔ اس نے دھیرے سے قمرالدین کا سر زمین پر رکھا، دل ہی دل میں اسے خدا حافظ کہا اور تیزی سے مرادنگر قصبے کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ ایک کلومیٹر بھی نہیں چلا ہوگا کہ اسے سامنے سے ایک موٹر سائیکل آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے سڑک پر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ بائیں طرف ایک پرانا پیشاب گھر تھا اور اس کے پیچھے تھا 220-KVA کا ایک بڑا بجلی گھر۔ ذوالفقار نے لگ بھگ دوڑتے ہوئے اسی میں پناہ لی۔ اسی وقت تیز رفتار سے سڑک پر ایک موٹر سائیکل گزری۔ ذوالفقار کو ابھی تک یاد ہے کہ وہ اونچی آواز میں بات کر رہے تھے اور بات چیت سے ایسا لگا کہ ڈھابے سے گئے دونوں لوگ کسی پولیس والے کے ساتھ لوٹ رہے ہیں۔ اندر چھپے چھپے اس نے کچھ اور گاڑیوں کو تیز رفتار سے گنگ نہر کی طرف جاتے سنا، لگا کہ تھانے سے پولیس کے لوگ جائے واردات کی

طرف جارہے تھے۔

جب آپ برسوں بعد کسی ایسے واقعہ کو یاد کر رہے ہوں جو بھلے ہی آپ کو موت کے منھ تک لے گیا ہو لیکن اس میں سے بچ نکلنے کے بعد آپ اچانک پاتے ہیں کہ آپ سیلبرٹی ہو گئے ہیں تو کئی بار میڈیا کرمیوں یا ایکٹوسٹوں کے سامنے جو کچھ واقع ہوا اسے سناتے سناتے آپ ماہر قصہ گو بن جاتے ہیں اور جانے انجانے اپنے بیانیے میں کافی کچھ اپنے تخیل سے جوڑتے گھٹاتے چلتے ہیں۔

ذوالفقار نے مجھے بتایا کہ پہلے گزرنے والی موٹر سائکل پر بیٹھے لوگ تیز آواز میں باتیں کر رہے تھے اور ان کی بات چیت کا جتنا حصہ اس کے کانوں میں پڑا اس کے مطابق وہ اسے مارنے کے لیے جارہے تھے۔ 24 برس بعد اس واقعے کو اس سے سنتے ہوئے مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ بیشتر بیان اس کے تخیل کی اڑان کی پیداوار تھے۔ جن پولیس والوں کو اس نے گنگ نہر کی طرف جاتے سنا تھا وہ وہی تھے جو بعد میں گنگ نہر سے تین زندہ گھائلوں کو نکال کر تھانہ مرادنگر لائے۔ ان میں سے پہلا تو قمرالدین ہی تھا جسے ڈھابوں کے پاس ذوالفقار چھوڑ گیا تھا۔ باقی دونوں مجیب الرحمٰن اور محمد عثمان تھے۔ لنک روڈ تھانے پر بیٹھے ہوئے 22/23 مئی، 1987 کی رات جب میں نے مرادنگر کے تھانیدار راجندر سنگھ بھگور سے وائرلیس پر بات کی تھی تب اس نے انھی تینوں کا ذکر کیا تھا۔ یہ بات الگ ہے کہ 17 ستمبر 2009 کو ایڈیشنل سیشنز جج، ایم آر سیٹھی کے سامنے اپنے لمبے بیان میں بھگور نے جو بیان دیا وہ لفظ بہ لفظ ذوالفقار کے بیان سے نہیں ملتا تھا لیکن لمبے عرصے کے بعد اگر دو لوگ ایک ہی واقعہ کو الگ الگ بیان کر رہے ہوں تو یہ فطری ہے کہ ان کے حقائق میں کچھ نہ کچھ فرق ہو ہی جائے گا۔

واضح تھا کہ ذوالفقار مجھ سے جس گفتگو کا ذکر کر رہا تھا وہ اس کے تخیل کی ہی اپج تھی لیکن میں نے اسے ٹوکا نہیں اور بولنے دیا۔

ذوالفقار نہ جانے کتنی دیر تک اسی پیشاب گھر میں چھپا رہا۔ رمضان کا مہینہ تھا اور

اس نے پچھلے چوبیس گھنٹوں سے بھی زیادہ عرصے سے کچھ کھایا نہیں تھا۔ جس وقت پکڑ کر اسے گھر سے باہر سڑک پر لایا گیا، وہ روزے سے تھا۔ گرفتار کرنے والوں نے اسے روزہ توڑنے کا بھی وقت نہیں دیا تھا۔ اس وقت ٹیستے زخم سے زیادہ بھوک سے مروڑتی آنتیں تکلیف دے رہیں تھیں۔ غنیمت تھا کہ پیشاب گھر استعمال میں نہیں آتا تھا لیکن پرانے استعمال کی بدبو تو تھی ہی۔ بیچ بیچ میں وہ اچک اچک کر یا دائیں بائیں جھانک جھانک کر باہر سڑک پر دیکھ لیتا تھا۔ دہلی غازی آباد سے ہو کر میرٹھ کے راستے دہرادون جانے والی یہ سڑک عام دنوں میں کافی مصروف رہتی تھی اور باوجود اس کے کہ آگے میرٹھ میں کرفیو لگا ہوا تھا، سڑک پر آمد و رفت برقرار تھی۔ ذوالفقار کے اندر بیٹھا ہوا ڈر اسے کسی کو بھی پکارنے سے روک رہا تھا۔ دوپہر ہوتے ہوتے وہ لگ بھگ نڈھال ہو گیا۔ زخموں سے خون کا رسنا بند ہو گیا تھا لیکن ذرا بھی ہلنے ڈلنے سے جو ٹیس اٹھتی وہ کئی بار ناقابل برداشت ہو جاتی تھی۔ ایک بار تو بھوک اور پیاس کے مارے ذوالفقار کے صبر نے جواب دے دیا اور وہ پیشاب گھر سے نکل کر لگ بھگ سڑک تک آ گیا لیکن تبھی اسے مرادنگر کی طرف سے ایک جیپ آتی ہوئی دکھائی دی۔ یہ پولیس کی گاڑی تھی یا نہیں، یقین سے نہیں کہا سکتا تھا لیکن خوف اس کی پسلیوں کو جھنجھوڑتا ہوا اندر تک دوڑ گیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا واپس پیشاب گھر کی طرف بھاگا۔ غنیمت تھا ابھی تک اتنی بھیڑ بھاڑ والی سڑک پر بھی کسی نے اس کی اس بھاگ دوڑ پر دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ کافی دیر تک سن سا پڑا رہا لیکن بھوک پیاس نے ایک بار پھر اسے فعال کر دیا۔ وہ اچک کر پیشاب گھر کی باہری دیوار سے سڑک پر جھانکنے لگا۔

سڑک کی دوسری پٹری پر ایک ہینڈ پمپ دکھائی دیا۔ پمپ کیبر ابر سے ایک گلی اندر جاتی دکھائی دی۔ پیاس سے اسے اپنے حلق میں کانٹے سے اگتے محسوس ہو رہے تھے اور اب تو تھوک نگلنے میں بھی دقت ہونے لگی تھی۔ وہ ہمت کر کے پمپ پر جا کر اپنا گلا تر کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اسے گلی میں کچھ ایسا نظر آیا کہ اس کا ڈر کافی حد تک کافور ہو گیا۔ سر پر گول ٹوپی اور اونچے پانچوں کے پاجاموں کے ساتھ کرتے پہنے کچھ لوگ

دکھائی دیے، پہلے اکا دکا پھر چھوٹے چھوٹے گروہوں میں۔ ذوالفقار کو یاد آیا کہ عصر کی نماز کا وقت ہو چلا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ جو گلی نظر آ رہی تھی اس میں مسلمانوں کی خاصی بڑی بستی ہے اور رمضان میں روزہ دار عصر کی نماز پڑھنے باہر سڑک پر نکل آئے ہیں۔ اس کا مطلب آس پاس کوئی مسجد بھی ہے، ذوالفقار نے سوچا، اور پیشاب گھر سے باہر نکل آیا۔
بھوک پیاس اور زخم کے احساس کے باوجود اس نے لگ بھگ دوڑتے ہوئے سڑک پار کی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ ہینڈ پمپ کے پاس رکا، لگ بھگ ہانپتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے ہینڈ پمپ چلانے کی کوشش کی اور کمزور کوشش کے باوجود جو تھوڑا بہت پانی نل سے ٹپکا اسے دوسرے ہاتھ کے چلو میں لے کر پینے کی کوشش کی۔ پانی کے چند گھونٹوں نے کانٹے اگے حلق میں تھوڑی سی نرمی پیدا کی۔ وہ تیزی کے ساتھ گلی میں گھسا۔ اس کی بے ڈھنگی چال، خون اور کیچڑ لگے کپڑوں اور اجنبی چہرے میں کچھ ایسا تھا کہ گلی میں چلتے ہوئے لوگ نہ صرف ٹھٹک کر رک گئے بلکہ انھوں نے اسے گھیر بھی لیا۔ وہ سبھی مسلمان تھے اور ان کی سرگوشیوں اور چہرے پر پھیلے ملے جلے خوف اور تجسس سے یہ واضح ہو گیا تھا کہ نہر پر پچھلی رات ہوئے حادثے کے بارے میں انھیں اڑتی پڑتی خبر ہے، اور وہ ذوالفقار سے سن کر حقیقت جاننا چاہتے ہیں۔ سڑک پر بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی اور ذوالفقار کا بیان سوالوں کے شور وغل میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ تبھی ایک بزرگ نے صلاح دی کہ سڑک پر بھیڑ لگانا ٹھیک نہیں ہے۔ پولیس کو پتا چل سکتا ہے اور ذوالفقار پھر سے گرفتار ہو سکتا ہے۔ اسے کسی کے گھر جانا پڑے گا۔

کون لے جائے گا ذوالفقار کو اپنے گھر؟ ایک سوال تھا جس نے تھوڑی دیر کے لیے سب کو خاموش کر دیا۔ اس کی خوف زدہ نظریں لوگوں کے چہروں پر دوڑتی رہیں۔ وقت جیسے رک سا گیا تھا۔ تبھی ایک ادھیڑ آدمی نے ذوالفقار کے کندھے پر تھپکی دی اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ مین روڈ چھوڑتے ہوئے وہ اس کے پیچھے پیچھے ایک گلی میں گھس گیا اور پھر ایک مکان میں۔ ذوالفقار کو بعد میں پتا چلا کہ وہ کسی ایوب نام کے آدمی کے

ساتھ تھا جس کا گھر نہر کے قریب تھا۔ اسے بدلنے کے لیے دوسرے کپڑے دیے گئے، ڈاکٹر خالد کو بلایا گیا جنھوں نے اس کے زخموں پر کچھ دوائیاں لگائیں اور پھر دو دن سے چل رہے روزے کو توڑنے کا انتظام کیا گیا۔ عدالت میں پہلے گواہ کے روپ میں گواہی دیتے ہوئے ذوالفقار نے بتایا تھا کہ اسے حکیم کو دکھایا گیا تھا۔ میں نے جب اس کا دھیان اس طرف دلایا تب اس نے ہنستے ہوئے کہا کہ اس نے جان بوجھ کر ڈاکٹر خالد کا نام نہیں لیا کیونکہ وہ بھی قانونی پچڑے میں پھنس سکتے تھے۔ کھاتے پیتے اور ایوب کے پریوار والوں کو سرگوشیوں میں اس حادثے کے بارے میں بتاتے ہوئے 18 سال کا ذوالفقار کب سو گیا اسے پتا بھی نہیں چلا۔

دوسرے دن صبح جب وہ اٹھا تب تک دن چڑھ آیا تھا۔ اسے تھوڑا وقت لگا سب کچھ یاد کرنے میں۔ رات ڈاکٹر نے زخموں پر اچھی طرح سے مرہم پٹی کر دی تھی جس کے کارن درد کا احساس کافی کم ہو گیا تھا لیکن جیسے ہی وہ اٹھ کر بیٹھا اسے اپنے زخموں سے بوند بوند کر درد ٹپکتا ہوا محسوس ہوا۔ بستر سے اتر کر غسل خانے تک جانا پہاڑ ہو گیا۔

ایوب کے گھر والے خاموشی سے چل پھر رہے تھے۔ انھیں سرگوشیوں میں آپس میں بات کرتے دیکھ کر ذوالفقار کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ ڈرے ہوئے ہیں۔ ظاہر تھا کہ وہ کسی لفڑے میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ کل تو جوش میں وہ اسے گھر لے آئے تھے لیکن اب سچائی انھیں ڈرا رہی تھی۔ قصبے میں پوری بھیڑ کے سامنے ذوالفقار ان کے گھر آیا تھا اور اب تو یہ بات چاروں طرف پھیل گئی ہوگی۔ کسی دوسرے متوسط خاندان کی طرح وہ بھی پولیس کچہری کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ بھنچے چہروں اور دبے لہجے میں انھیں بات کرتے دیکھ کر ذوالفقار کا چہرہ اتر گیا۔ وہ اسے گھر سے باہر تو نہیں نکال دیں گے؟ یا کہیں پولیس کو ہی نہ سونپ دیں!

ایک گلاس میں چائے لے کر محمد ایوب اس کے پاس آیا۔ جتنی دیر ذوالفقار نے

چائے پی اتنی دیر میں محمد ایوب نے اس سے جو کچھ کہا اس کی مراد یہ تھی کہ اس کا خاندان ذوالفقار کی مدد کرنا ایک دینی فریضہ سمجھتا ہے لیکن وہ کسی پچڑے میں نہیں پڑنا چاہتے۔ ذوالفقار جہاں کہے گا وہ اسے وہاں پہنچانے کا انتظام کردے گا۔ ذوالفقار کا چہرہ اتر گیا اور اسے لگنے لگا کہ ایوب اور اس کا خاندان اچانک اسے اٹھا کر سڑک پر پھینک دے گا اور ایک بار پھر درندے اسے دبوچ لیں گے۔ اس نے گھبرائی نگاہوں سے اپنے میزبان کی طرف دیکھا۔ ایوب کے چہرے پر کچھ تھا جس نے اسے مطمئن کردیا۔ وہ اسے سڑک پر تو نہیں پھینکیں گے لیکن اسے جلدی ہی کوئی جگہ طے کرنی ہوگی جہاں وہ جا کر چھپ سکے اور ممکنہ موت سے خود کو بچا سکے۔ فطری تھا کہ پہلا مقام جو اس کے دماغ میں آیا وہ ہاشم پورہ کا اس کا اپنا گھر تھا جہاں کے راحت انگیز محفوظ ماحول میں اس کا بچپن بیتا تھا اور جو 22 مئی 1987 سے پہلے ہر سکھ دکھ میں اس کا گواہ تھا۔ ایوب نے اس امکان کو سنتے ہی خارج کردیا۔ ایک تو سویرے کے اخبار میں پڑھی خبر کے مطابق میرٹھ شہر میں اب بھی کرفیو لگا ہوا تھا اور دوسرے ایک امکان یہ بھی ہوسکتا تھا کہ قاتل بچے ہوئے لوگوں کو اب تک تلاش کررہے ہوں۔ اگلی جگہ جو ذوالفقار کے دماغ میں آئی وہ اس کے چاچا کی سسرال تھی۔ چاچا کے سسر میرٹھ سے چودہ پندرہ کلومیٹر دور بوڑھ برال گاؤں میں رہتے تھے۔ تھوڑے بحث مباحثے کے بعد وہیں جانا طے ہوگیا۔

ایوب نے ایک موٹر سائیکل کا انتظام کیا اور اس پر، ڈرائیور اور ایک دوسرے آدمی کے بیچ میں ذوالفقار بیٹھا اور وہ وہاں سے بوڑھ برال کے لیے روانہ ہوئے۔ اس درمیان میں جتنی تیزی سے خون سے تر بتر اس کے کپڑے بدلے گئے، اسے ناشتہ کرایا گیا اور اس کے سفر کے لیے موٹر سائیکل کا انتظام کیا گیا اس سے یہ واضح ہوگیا کہ ایوب اور اس کا خاندان اس کے جانے کے فیصلے سے کتنی راحت محسوس کررہا تھا اور یہی راحت اسے باہر چھوڑنے آئے اس کے اہل خانہ کے چہروں پر بھی نظر آرہی تھی۔ بیچ میں بیٹھے ذوالفقار کو جو بے ناپ کے نئے کپڑے دیے گئے تھے ان کے بے ڈھنگے پن کو چھپانے کے لیے

اسے ایک چادر اڑھا دی گئی تھی اور جب موٹر سائیکل تین سواروں کو لے کر غازی آباد میرٹھ کی شاہراہ پر پہنچی تو اندر کے خوف اور گھبراہٹ نے اسے اس چادر کو اپنے چاروں طرف کس کر لپیٹ لینے کے لیے اکسایا اور وہ اپنے آگے پیچھے بیٹھے دونو سواروں کے بیچ ایک گٹھری کی مانند سمٹ گیا۔

مرادنگر سے بوڑھ برال تک لگ بھگ 30-25 کلومیٹر کی دوری جیسے ایک لامختتم سفر بن گئی۔ ابھی دن کا پہلا پہر تھا اور لوگ دھیرے دھیرے کام دھندھے کے لیے نکلنے لگے تھے لیکن میرٹھ کے دنگوں کا اثر وہاں بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کم بھیڑ بھاڑ والی سڑک پر تیز رفتار سے بھاگتی موٹر سائیکل پر بیچ میں بیٹھے اور گٹھری بنے ذوالفقار کی روح کسی بھی پولیس والے کو آتے جاتے دیکھ کر کانپ جاتی تھی۔ جب موٹر سائیکل سڑک سے بوڑھ برال جانے والے راستے پر مڑی تب جا کر ذوالفقار کی جان میں جان آئی۔

چاچا کے سسر محمد یعقوب ایک مجھولے درجے کے کھاتے پیتے کسان تھے اور ذوالفقار اکثر وہاں آتا جاتا رہتا تھا، کئی بار چاچا کے ساتھ اور کئی بار اکیلے۔ خاص طور سے گرمیوں کی چھٹیوں میں جب آم کی فصل تیار ہو۔ اگر میرٹھ میں اس وقت دنگے نہ چل رہے ہوتے تو ویسے بھی وہ ان دنوں یہاں ہوتا تھا۔ اس وقت یعقوب کے گھر میں کسی کو اس کے وہاں آنے کی امید نہیں تھی اور خاندان کے جو لوگ اسے گھر کے باہر ملے، اَن ہونی کے خدشے نے ان کے چہرے اتار دیے۔ پہلا سوال سنتے ہی ذوالفقار کی رُلائی چھوٹ گئی۔ وہ کچھ بھی بتائے بنا صرف روتا رہا، روتا رہا۔ ایک لڑکا اسے سہارا دے کر گھر کے اندر عورتوں کے پاس لے گیا۔ باہر مرادنگر سے آئے نوجوانوں نے، جتنی کچھ جانکاری ان کے پاس تھی، گھر والوں سے بانٹی۔ اس بیچ گاؤں کے بھی کچھ لوگ وہاں اکٹھے ہو گئے اور بات چیت سرگوشیوں اور چہروں پر تناؤ میں تبدیل ہو گئی۔ خاص طور سے گھر کے مکھیا کی چنتا اس کی حرکات وسکنات سے صاف جھلکنے لگی تھی۔ گاؤں کے لوگ روایت کے مطابق کسی بھی گھر میں مہمان کے آنے پر بن بلائے آجاتے تھے، اور آج بھی یہی ہوا تھا۔ موٹر

سائیکل پر تین لوگوں کو گاؤں میں داخل ہوتے دیکھ کر کھیتوں میں کام کرتے، گلیوں سے گزرتے یا اپنے دروازے پر بیٹھے لوگوں نے تجسس سے انھیں دیکھا اور بنا بلاوے کے، دراصل جس کی ضرورت بھی نہیں تھی، ان میں سے بہت سے محمد یعقوب کے گھر پہنچ گئے۔

جیسے جیسے بھیڑ بڑھتی گئی، مشتعل آوازوں کا شور دھیما پڑتا گیا، خاص طور سے گھر والوں نے تو آپس میں سرگوشیوں باتیں کرنی شروع کر دیں۔ ان کی دہشت فطری تھی۔ گاؤں میں بہت سے لوگ اس خاندان سے حسد رکھتے تھے اور ان میں سے کوئی بھی بھاگ کر پولیس تھانے جا سکتا تھا۔ یہ پتا چلنے پر کہ انھوں نے اپنے گھر میں کسی زخمی کو چھپا رکھا ہے پولیس والے کبھی بھی آدھمک سکتے تھے۔ ایک بزرگ اندر گیا اور اس نے ذوالفقار کو باہر نکلنے سے منع کر دیا۔ اگلے چار پانچ دن محمد یعقوب کے خاندان میں اس کے لیے کسی اذیت کی طرح گزرے جن میں انھوں نے ذوالفقار اور باہری دنیا کے بیچ کسی طرح کا کوئی رابطہ نہیں ہونے دیا۔ جب تک ذوالفقار وہاں رہا اسے گھر میں پھیلے تناؤ اور خوف کا احساس ہوتا رہا۔ اسے دن کے اجالے میں باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی، وہ یا تو منھ اندھیرے باہر نکلتا یا پھر دیر شام دن ڈوبنے کے بعد۔ گھر والوں کی بات چیت سے یہ اندازہ ضرور ہو رہا تھا کہ وہ اسے کہیں اور بھیجنے کے لیے محفوظ جگہ تلاش کر رہے ہیں۔ تیسرے دن ابھی وہ سو ہی رہا تھا کہ کسی نے اسے اٹھایا اور فوراً تیار ہونے کے لیے کہا۔ وہ سمجھ گیا کہ اسے کہیں اور جانا ہے۔ تب تک موت کا خوف کچھ کم ہو گیا تھا اور زخم بھی کچھ کم دُکھنے لگے تھے۔ بنا کچھ پوچھے اس نے تیاری شروع کی اور ابھی جبکہ باہر اندھیرا پسرا ہوا تھا اور گاؤں میں لوگوں نے روز کے معمولات شروع بھی نہیں کیے تھے، ایک موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ کر اس کا سفر پھر شروع ہوا۔ اس بار موٹر سائیکل اس کا ایک رشتہ دار چلا رہا تھا اور گاؤں سے باہر نکلتے ہی جب وہ بائیں طرف مڑی وہ سمجھ گیا کہ وہ لوگ غازی آباد میں اس کے پھوپھا معراج الدین کے گھر کی طرف جا رہے ہیں۔ پچھلے دو دنوں میں جب چھپنے کے ممکنہ ٹھکانوں کے بارے میں بات ہو رہی تھی تو بار بار معراج

الدین کا ذکر آتا تھا۔

پو پھٹنے لگی تھی اور تیز رفتار سے بھاگتی موٹر سائیکل پر بیٹھے ذوالفقار کو ہوا میں نمی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے زخموں کو چھپانے کے لیے اوڑھی ہوئی چادر کس کر لپیٹ لی اور سڑک پر جان پہچان کے نشانات تلاشنے لگا۔ اسی سڑک پر 22 مئی کی رات پی اے سی کے ٹرک پر لد کر وہ انھی سب جگہوں سے گزرا تھا۔ حالانکہ ٹرک کے پچھلے حصے میں پی اے سی والوں کے پیچھے اکڑوں بیٹھے باہر کچھ دیکھ پانا ممکن نہیں تھا پھر بھی آج صبح نظر آنے والا ہر پیڑ، مکان یا گلی اسے جانے پہچانے سے لگ رہے تھے۔ وہ ملے جلے احساس کے ساتھ آس پاس تیزی سے بھاگتی دنیا کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک جیسے اس کا بدن کاٹھ ہونے لگا۔ موٹر سائیکل جس جگہ پہنچی وہاں سے گنگ نہر صاف دکھائی دینے لگی تھی۔

تیز رفتار سے دوڑتی ہوئی موٹر سائیکل جب پل سے گزری تو خوف سے ادھ مُندی آنکھوں سے نہر کے بہتے پانی کو دیکھ کر ذوالفقار کو لگا کہ اس میں اب بھی لاشیں بہہ رہی ہیں اور کوئی اپنا ایک ہاتھ پانی سے باہر نکالے اسے مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ ڈھابوں کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے گھائل قمر الدین یاد آیا۔ پتا نہیں وہ بچا یا مر گیا؟ نہر سے اس کے ساتھ نکلے عارف کا کیا ہوا ہوگا؟ ڈرائیور کی پیٹھ پر لگ بھگ سر گڑائے اور چادر سے اپنا بدن پوری طرح ڈھکے ہوئے ذوالفقار نے اچٹتی نظروں سے وہ پیشاب گھر دیکھا جہاں اس نے آدھے سے زیادہ دن گزارا تھا، اس گلی کو دیکھ کر اس کا دل احسان مندی کے جذبے سے بھیگ گیا جس میں اسے ایوب کے گھر پناہ ملی تھی اور جس کی وجہ سے آج وہ زندہ تھا۔ مرادنگر قصبہ پار کرنے کے بعد تیس چالیس منٹ اور لگے ہوں گے کہ وہ شہر غازی آباد کے پر پیچ گلیوں والے پرانے حصے میں گھس گئے۔ آنتوں کی طرح پھیلی گلیوں میں وہ جس مکان کے سامنے رکے وہ اس کے پھوپھا معراج الدین کا تھا۔ ذوالفقار کو دیکھتے ہی گھر میں کہرام مچ گیا۔ ہاشم پورہ سے خبریں یہاں تک پہنچ چکی تھیں اور کسی کو نہیں پتا تھا کہ اٹھائے گئے لوگوں میں کون زندہ بچا ہے اور کون مر گیا۔ ذوالفقار کی

پھوپھی نے دیکھتے ہی اسے چمٹا کر رونا شروع کر دیا۔ باہر بیٹھک میں پھوپھا نے بوڑھ برال سے آئے موٹر سائیکل سوار کی خاطر تواضع شروع کی اور اندر ہچکیوں اور آنسوؤں کے بیچ ہاشم پورہ کی گاتھا ٹکڑوں ٹکڑوں میں سنی سنائی گئی۔ پہنچانے والا واپس چلا گیا تو اس گھر میں بھی پچھلے پناہ دینے والوں کی طرح سوچ بچار شروع ہوا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ واقعہ کو پیش آئے کافی وقت ہو چکا تھا اور یہ گھر شہر کے بیچوں بیچ تھا جہاں سے ذوالفقار کے واپس پکڑے جانے کے امکانات کم سے کم تھے۔

پھوپھا معراج الدین کے کچھ سیاسی تعلقات بھی تھے، ان میں سے ایک نواب الدین انصاری ایڈووکیٹ کافی فعال شخص تھے۔ جب ذوالفقار مجھے یہ قصہ سنا رہا تھا، مجھے یاد آیا کہ نواب الدین انصاری نام کے ایک صاحب غازی آباد میں میرے تقرر کے دوران مجھ سے ملا کرتے تھے اور کسی مسلم سیاسی جماعت سے جڑے ہوئے تھے، ممکن ہے مسلم لیگ یا مسلم مجلس سے ان کا تعلق ہو۔ معراج الدین نے دوسرے دن نواب الدین انصاری سے ذوالفقار کی ملاقات کرائی۔ نواب الدین اور معراج الدین اگلے دن دہلی میں محسنہ قدوائی کے پاس گئے۔ محسنہ قدوائی اتر پردیش کی سیاست میں ایک جانی پہچانی شخصیت تھیں اور ان دنوں میرٹھ سے کانگریس کی ایم پی بھی تھیں۔ وہ دہلی میں 12، جن پتھ پر رہا کرتی تھیں۔ ذوالفقار کے مطابق محسنہ قدوائی نے ان کی کسی قسم کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے ممبر پارلیمنٹ سید شہاب الدین سے ملے۔ 15 مئی 2011 کو میں نے سید شہاب الدین سے، جو اس دوران جنتا دل سے ایم پی تھے، ایک لمبا انٹرویو لیا اور اس دوران انھوں نے مجھے بتایا کہ نواب الدین انصاری اور معراج الدین کو محسنہ قدوائی کی کوٹھی میں مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ لوگ تھوڑی ہی دور پر واقع ان کی کوٹھی پر جائیں۔ وہ 14، جن پتھ پر رہتے تھے۔ میرٹھ سے لوک سبھا کی ممبر چنی جانے اور خود مسلمان ہونے کے باوجود محسنہ قدوائی نے فساد زدگان کی مدد کرنے سے کیوں انکار کیا ہوگا؟ یہ ایک ایسی گتھی ہے جسے میں بعد میں سلجھانے کی کوشش کروں گا۔

سید شہاب الدین مجھے ہمیشہ سے ہندوستان کی سیاست میں ایک دلچسپ وجود لگتے رہے ہیں۔ میں نے فرقہ واریت کے ایک متجسس محقق کے روپ میں ان کے کیریئر کے اتار چڑھاؤ پر بڑی دل چسپی سے نظر رکھی ہے۔ فرقہ وارانہ تعصب پر منعقد ہونے والی کئی نشستوں میں میری ان سے چھوٹی بڑی بہت سی ملاقاتیں ہوئی تھیں لیکن دو لمبی ملاقاتوں کا ذکر، جو ہاشم پورہ کے تعلق سے ہوئی تھیں، یہاں درست ہوگا۔ پہلی ملاقات تو ہاشم پورہ کے فوراً بعد ہی ہوئی تھی، تاریخ تو مجھے ٹھیک یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ تب تک ہاشم پورہ کو واقع ہوئے تین چار مہینے ہی ہوے تھے اور فلم ساز انور جمال مجھے ان کے گھر 14، جن پتھ لے کر گئے تھے۔ میرے حافظے میں اب بھی کتابوں سے پٹا وہ کمرہ محفوظ ہے جو باہر کے اجالے سے اندر گھسنے پر ایک پراسرار نیم تاریکی میں ڈوبا سا لگا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کتابوں کے ڈھیر میں چھپے گھر کے مالک کو تلاش کر رہا تھا لیکن وہاں اکثر آنے کے سبب انور جمال کے سامنے میری جیسی کوئی دبدا نہیں تھی۔ اپنے عادی قدموں سے وہ اس کونے کی طرف بڑھے جہاں ایک چھوٹی سی اسٹڈی ٹیبل پر کتابوں کے ڈھیر کے پیچھے اوسط سے تھوڑا چھوٹے قد کا ایک شخص کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میز پر ایک ٹیبل لیمپ جل رہا تھا اور اس کی روشنی کچھ اس زاویے سے پڑ رہی تھی کہ اس کے پیچھے کھڑے شخص کا چہرہ واضح نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اتنا سمجھ میں آ گیا کہ یہی صاحب سید شہاب الدین تھے۔ میں انور جمال کی تقلید میں ادھر بڑھا۔ شہاب الدین صاحب تیزی سے میز کے پیچھے سے سامنے آئے اور انھوں نے لپک کر میرا آگے بڑھا ہوا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھو میں تھام لیا۔ کافی دیر تک وہ بھرے گلے سے جذباتی آواز میں کچھ بدبداتے رہے۔ مجھے اس جذباتیت کی توقع نہیں تھی اس لیے میں کچھ مضطرب ہو گیا۔ ہاشم پورہ کے واقعہ کی جانکاری ان تک پہنچ چکی تھی اور وہ بار بار میرا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ وقت انھیں نارمل ہونے میں لگا اور پھر اس دوپہر ہم تینوں نے بیٹھ کر کئی گھنٹے تک ہاشم پورہ کے بہانے دیش میں بڑھ رہی فرقہ واریت کے اسباب پر غور و فکر کیا۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ سید شہاب الدین مجھے ہمیشہ سے ہندوستان کی سیاست کی ایک دلچسپ ہستی لگتے رہے ہیں اور اس پہلی لمبی ملاقات میں بھی میں پوری دلچسپی سے انھیں بولتا ہوا سنتا رہا اور ان کی شخصیت کا مطالعہ کرتا رہا۔ تب تک میرا ماننا تھا کہ وہ ایک کٹر پنتھی سیاست کی نمائندگی کرتے ہیں اور ہندوستانی مسلمانوں میں، کمزور ہی صحیح، جو روشن خیال دھارا ہے اس کے مخالف ہیں۔ اس دوپہر ان سے بات کرتے ہوے میری سمجھ کئی معاملوں میں گڑبڑائی۔ وہ کوئی اونچے پائنچے والا پاجامہ پہنے، گول ٹوپی سے آدھی کھوپڑی ڈھکے یا بنا مونچھوں اور لمبی داڑھی پھہرانے والے مولانا نہیں تھے، بلکہ پینٹ شرٹ پہنے، صفاچٹ چہرے والے ایک ماڈرن ادھیڑ لگ رہے تھے۔ بہت نفیس اردو اور غیر معمولی گرفت والی انگریزی میں رک رک کر اور پوری منطق کے ساتھ اپنی بات کہتا ہوا یہ شخص کئی بار ایمانداری کے ساتھ سیکولرزم میں یقین کرتا سیاست داں نظر آتا تھا تو کئی بار دھرم اور سیاست میں گھال میل کرتا ایک چالاک اور موقع پرست کٹھ ملا۔ لیکن اس دوپہر لمبی بات چیت میں بہت سارے موضوعات پر بات چیت کرتے ہوے سید شہاب الدین نے مجھ سے اس معاملے کا ایک اہم فیکٹ چھپالیا تھا، جس کے بارے میں مجھے برسوں بعد ذوالفقار ناصر نے بتایا اور جس کی تائید سید شہاب الدین نے مورخہ 15 مئی 2011 کو دوسری لمبی بات چیت میں کی۔

محسنہ قدوائی کے گھر سے مایوس ہو کر نواب الدین انصاری اور معراج الدین سیدھے سید شہاب الدین کی کوٹھی پہنچے۔ شہاب الدین نے صبر سے ان کی بات سنی اور فوراً ذوالفقار ناصر کو اپنے گھر لانے کے لیے کہا۔ دوسرے دن وہ ذوالفقار کو لے کر ان کی کوٹھی پر پہنچ بھی گئے۔ سید شہاب الدین کی کوٹھی پر ہوا استقبال محسنہ قدوائی کی کوٹھی سے پوری طرح مختلف تھا۔ ذوالفقار کو نہ صرف گھر میں رہنے اور کھانے کی دعوت دی گئی بلکہ اگلے دس دنوں تک سید شہاب الدین کی ڈاکٹر بیٹی نے اس کا علاج بھی کیا۔ یہ فیکٹ پہلی ملاقات میں انھوں نے مجھے نہیں بتایا تھا۔ ممکن ہے پہلی بار سید شہاب الدین کے من میں مجھے لے

کر کچھ تذبذب رہا ہو اور انھیں لگا ہو کہ باوجود اپنی ساری نیک نیتی کے میں تھا تو پولیس والا ہی اور مجھے یہ بتا کر کہ گھائل ذوالفقار نے ان کے گھر میں پناہ لی تھی وہ یا ذوالفقار کسی پریشانی میں پھنس سکتے تھے۔ مجھ سے 15 مئی 2011 کی ملاقات کے دوران شہاب الدین نے نہ صرف فخر اور اطمینان ملے جلے احساس کے ساتھ یہ بتایا کہ کس طرح محسنہ قدوائی پریشان حال پہنچے میرٹھ کے مسلمانوں کو اپنے گھر میں پناہ دینے سے انکار کر دیتی تھیں اور انھی کی کوٹھی میں موجود کارکن ایسے لوگوں کو دھیرے سے تھوڑی ہی دوری پر واقع ان کی کوٹھی پر جانے کی صلاح دیتے تھے اور ایسے مظلوموں کو ان کے یہاں پناہ ملتی بھی تھی، انھوں نے ایک مطمئن باپ کی طرح اپنی کامیاب ڈاکٹر بیٹی کے ذریعے ذوالفقار ناصر کی خدمت کا ذکر بھی کیا۔

پہلے دن شہاب الدین کے گھر ذوالفقار ناصر کی نہ صرف مرہم پٹی کی گئی بلکہ 22 مئی کے بعد پہلی بار اچھا کھانا کھانے کے بعد آرام دہ بستر پر بلاخوف و تردد سکون سے سویا۔اسے پتا بھی نہیں چلا کہ اس بیچ سید شہاب الدین نے دیش کے تمام اہم سیاست دانوں سے رابطہ قائم کر کے اگلی حکمت عملی تیار کر لی تھی۔ دوسرے دن وہ جن لوگوں کے پاس لے جایا گیا ان کے نام اسے بہت بعد میں پتا چلے۔آج جب وہ سبرامنیم سوامی اور چندر شیکھر کا نام لیتا ہے تو اس کے چہرے پر وہی جھینپی سی مسکان دکھائی دیتی ہے جسے آپ کسی بھی مڈل کلاس ہندوستانی کے چہرے پر ایسے کسی واقعہ کا بیان کرتے وقت دیکھ سکتے ہیں جس میں اس کی ملاقات کسی بڑے سیاست داں، فلم اسٹار یا کرکٹ کھلاڑی سے ہوئی ہو۔

انھیں ملاقاتوں کا نتیجہ تھا کہ واقعہ کے نو دن بعد یکم جون 1987 کی سہ پہر کو جنتا پارٹی کے دفتر میں ذوالفقار ناصر کی زندگی کی پہلی پریس کانفرنس ہوئی جس میں کیمروں کی تیز چمکتی فلیش لائٹوں کے بیچ اس نے وہ خوفناک واقعہ بیان کیا جو 22 مئی کو ہاشم پورہ سے شروع ہوا اور جس کا خونیں انجام مرادنگر اور مکن پور میں نہروں کے کنارے تمام ہوا۔

اگر یہ پریس کانفرنس کسی دوسرے مہذب ملک میں ہوئی ہوتی تو نہ جانے کتنے سر کٹے ہوتے اور سرکاریں گر جاتیں لیکن آزادی کے بعد کی سب سے بڑی کسٹوڈیل کلنگ پر ہمارے دیش میں کچھ بھی ایسا نہیں ہوا۔ قومی اور ریاستی اخباروں نے اندر کے صفحوں پر اسے تھوڑی بہت جگہ ضرور دی لیکن سرکاری حلقوں میں کچھ خاص ردعمل ہوا ہو، اس کے شواہد نہیں ملتے۔

پریس کانفرنس کے بعد سرکاری ردعمل کی سب سے دل چسپ مثال وہ جوابی پریس کانفرنس ہے جس میں میرٹھ کے ضلع مجسٹریٹ آر ایس کوشِک، وہاں کے سابق سینئر پولیس سپرنٹنڈنٹ وی کے بی نائر اور نومقررہ سینئر پولیس سپرنٹنڈنٹ گردھاری لال شرما موجود تھے۔ نوکرشاہی کی بے شرمی کی روایت کے مطابق انھوں نے سرے سے ذوالفقار ناصر کو جھوٹا قرار دیتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ اس نام کا کوئی آدمی ہاشم پورہ میں رہتا ہی نہیں اور یہ کہ 22 مئی کو ہاشم پورہ سے گرفتار کیے گئے سبھی لوگ جیلوں میں تھے اور انھوں نے یہ بھی چنوتی دی کہ کوئی بھی آدمی تھانوں اور جیلوں کے دستاویز کو جانچ کر اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔ یہ تب جب کہ 22/23 مئی کی رات میرٹھ سرکٹ ہاؤس کی جس بیٹھک کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں اور جس میں ہاشم پورہ کے واقعہ کے بارے میں تفصیل سے میں نے وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ کو بتایا تھا، اس میں یہ سب افسران بھی شریک تھے پھر کیونکر وہ اتنا بڑا جھوٹ بول سکے ہوں گے کہ ہاشم پورہ سے گرفتار سبھی لوگ جیلوں میں تھے؟ کیا میرٹھ کے حاکموں کا یہ غرور صرف ان کی نالائقی کا اشاریہ تھا یا اس کے پیچھے ایک خاص طرح کی ذہنیت بھی تھی؟ اس کو سمجھنے کی کوشش میں آگے کروں گا۔ ان سبھی افسروں نے سی آئی ڈی کے سامنے بھی جھوٹ بولا کہ انھیں ہاشم پورہ کے بارے میں اخباروں سے پتا چلا تھا۔

اس کے بعد کی ذوالفقار ناصر کی داستان سید شہاب الدین کی مدد سے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ایک ٹیکنیکل کورس کی ڈگری لے کر زندگی میں ایک کامیاب کاروباری بننے کی

تو ہے ہی لیکن ہمارے لیے اس سے زیادہ اہم وہ رول ہے جو اس نے مولانا یامین، اقبال انصاری، رام پال سنگھ یا ورِندا گرو ور جیسے ایکٹوسٹوں کے ساتھ مل کر نبھایا ہے اور جس کی وجہ سے ہاشم پورہ کا معاملہ بستہ خاموشی میں دفن نہیں ہو پایا اور آج بھی زندہ ہے۔ اس کتاب کے لیے اس کا یہی رول بامعنی ہے۔

❁ ❁ ❁

4
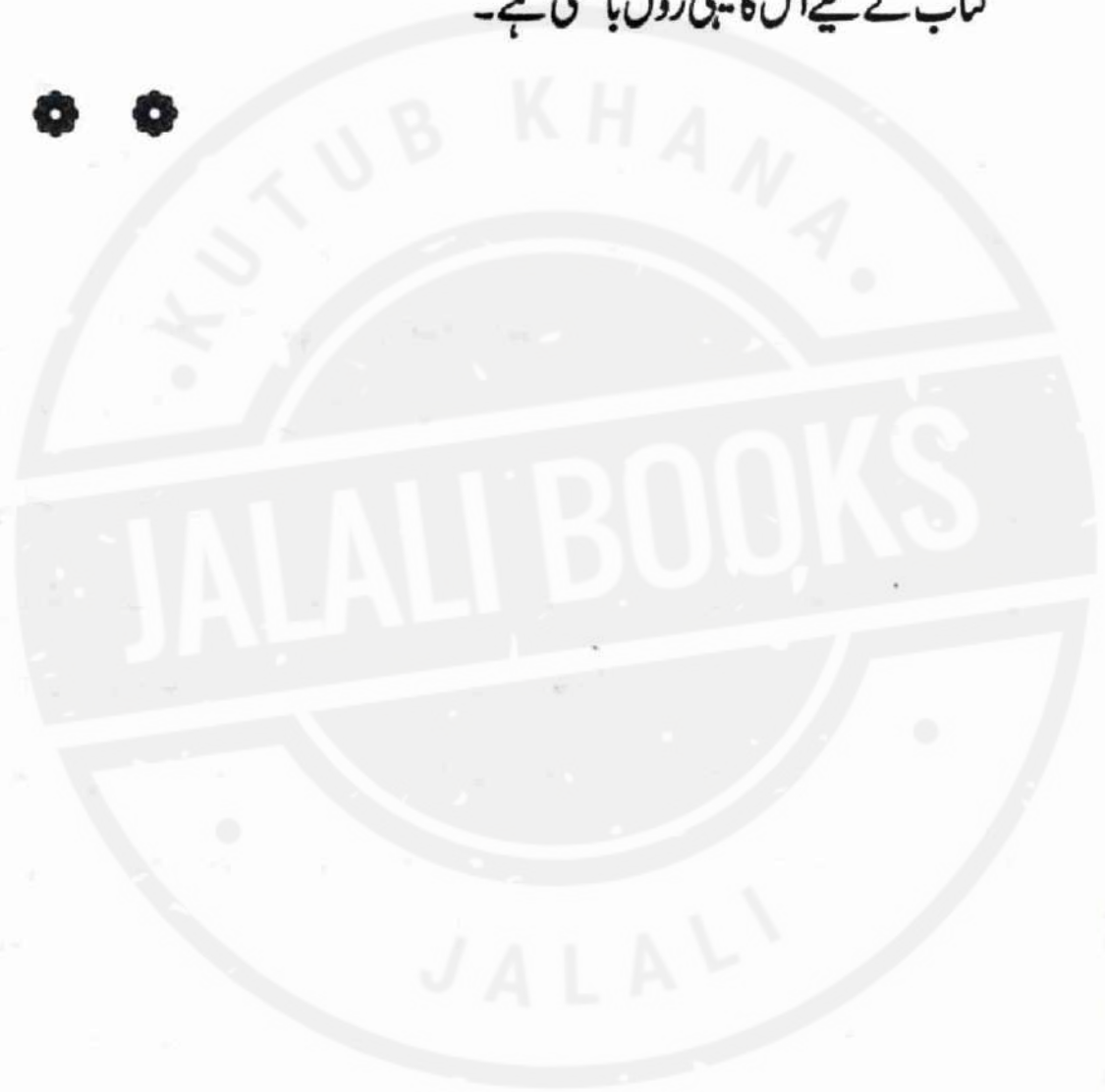
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

23 مئی کی صبح جب میں میرٹھ سے غازی آباد واپس لوٹا، آٹھ بجنے والے تھے۔ رات بھر کی تھکن اور بے خوابی کا بوجھ سر پر سوار تھا۔ رات پانچ چھ گھنٹے وزیر اعلیٰ اور ان کے سینئر عملے کی موجودگی میں میرٹھ سرکٹ ہاؤس میں جو کچھ پیش آیا تھا اسے یاد کرنے پر سب کچھ گڈمڈ سا ہوا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ بیتی رات خاکی کپڑوں میں جو شخص وزیر اعلیٰ سے پی اے سی کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے کے لیے بحث کر رہا تھا وہ میں نہیں کوئی اور ہی تھا۔ سب کچھ بہت دھندلا دھندلا اور کسی دوسرے کے ساتھ پیش آتا سا لگ رہا تھا۔

میں نے آنکھیں موندے موندے رات کے واقعات کی کڑیوں کو ایک بار پھر سے دہرانے کی کوشش کی۔ پچھلے سات آٹھ گھنٹے کے دوران جو کچھ ہوا تھا وہ اتنا نزدیکی ہوتے ہوئے بھی کتنی دور کا لگ رہا تھا۔ کل رات باب الدین کا بیان ختم ہونے کے بعد اور مرادنگر کے تھانیدار سے اس بات کی تائید ہو جانے پر کہ ممکن پور جیسا ہی کچھ مرادنگر کی گنگ نہر پر بھی ہوا تھا، میں نے اور ڈسٹرکٹ کلکٹر نے لنک روڈ تھانے میں موجود انتظامیہ اور پولیس کے سینئر افسروں سے وچار وِمرش شروع کیا۔ واقعہ اتنا گمبھیر اور سنگین تھا کہ ہر کوئی حیرت سے ساکت تھا اور کسی بھی طرح کی سیدھی رائے دینے سے بچ رہا تھا۔ میری سمجھ

میں یہ بات بڑی صاف تھی کہ مسلمان ہونے کی وجہ سے ضلع مجسٹریٹ نسیم زیدی بڑے ہی تذبذب کی صورت حال سے دوچار تھے اور مجھے ہی بہت سارے فیصلے لینے پڑیں گے۔ یہ سارے فیصلے قانونی اور اخلاقی اعتبار سے اتنے صحیح تھے کہ وہاں موجود کوئی بھی افسر اس کی مخالفت نہیں کر پایا۔ پہلا فیصلہ یہ لیا گیا کہ مرادنگر تھانے میں جو تین گھائل موجود ہیں انھیں اور لنک روڑ تھانے سے باب الدین کو بلا تاخیر موہن میکنس اسپتال روانہ کیا جائے۔ ان دنوں اسی اسپتال میں غازی آباد کی علاج کی بہترین خدمات فراہم تھیں، اور یہ لنک روڈ اور مرادنگر تھانوں سے سب سے قریب بھی تھا۔ میں نے تھانہ لنک روڈ کے وائرلیس سے مرادنگر کے تھانیدار راجندر سنگھ بھگور کو اس کا حکم جاری کروایا اور اسے یہ بھی آدیش دیا کہ گھائلوں کی حفاظت کے لیے اسپتال میں پولیس کی گارد لگائی جائے۔ ان گھائلوں میں سے ایک قمرالدین راستے میں ہی مر گیا اور بقیہ دو وہاں سے پوری طرح صحت یاب ہو کر نکلے۔ دہلی خبر پہنچنے پر تیسرے دن وزیر اعظم راجیو گاندھی کی ہدایت پر ان کی حفاظت کے لیے سی آر پی ایف (Central Reserved Police Force) کی گارد لگادی گئی۔

دوسرا فیصلہ زیادہ مشکل تھا۔ اتنے خوف ناک واقعہ پر قانونی کارروائی کیا کی جائے؟ سیدھا سپاٹ جواب یہ ہونا چاہیے تھا کہ قاتلوں کے خلاف اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ مسلح پولیس کا عملہ ہیں، قتل کا مقدمہ قائم کیا جائے اور اس معاملے میں بھی وہی سب کارروائی کی جائے جو کسی بھی دوسرے ملزموں کے معاملے میں کی جاتی ہے۔ مثلاً ہمیں فوراً ان کی بٹالین میں چھاپہ مار کر اس گاڑی کو برآمد کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی جس پر بیٹھ کر وہ آئے تھے اور اس بات کا پورا امکان تھا کہ اس ٹرک میں خون کے دھبوں سمیت بہت سے ثبوت مل سکتے ہیں۔ پی اے سی کے اس عملے کو جو اس واقعہ کو انجام دینے کے بعد بھاگ کر ابھی میرٹھ پہنچے ہی ہوں گے، گرفتار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور ان کے ہتھیاروں کو ضبط کرنا چاہیے جو مقدمے کی تفتیش میں بہت اہم ثبوت ثابت ہو سکتے تھے۔

لیکن کیا یہ اتنا آسان تھا؟ میرٹھ میں تیس سے زیادہ پی ایس سی کی کمپنیاں تعینات تھیں اور کمرے میں موجود پولیس افسروں کی یادداشت میں 1973 کی پی اے سی کی وہ بغاوت محفوظ تھی جسے فوج کی مدد سے کافی مشکل سے دبایا جا سکا تھا۔ ہمارے پاس جو فورس مہیا تھی کیا اس کے بوتے پر ہم میرٹھ جا کر ان پی اے سی والوں کو گرفتار کر پائیں گے جو واردات کو انجام دے کر واپس اپنے کیمپ لوٹ چکے تھے؟ ان کی گرفتاری پر میرٹھ شہر میں موجود ڈھائی ہزار سے زیادہ پی اے سی عملے کا ردعمل کیا ہوگا، یہ کسی کو بھی واضح نہیں تھا۔

میں نے ضلع مجسٹریٹ سے کہا کہ ہمیں اس معاملے میں ڈائرکٹر جنرل آف پولیس سے بات کرنی چاہیے۔ مجھے پتا تھا کہ پولیس ڈائرکٹر جنرل دیا شنکر بھٹنا گر میرٹھ میں کیمپ کر رہے ہیں۔ میں نے افسروں سے درخواست کی کہ وہ میرے ساتھ میرٹھ چلیں اور پولیس ڈائرکٹر جنرل کو پورے واقعہ کی خبر کرتے ہوئے مجرم پی اے سی عملے کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے ضروری فورس مہیا کرانے کی درخواست کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ فورس سی آر پی ایف، بی ایس ایف (Border Security Force) یا فوج ہو سکتی تھی۔ نسیم زیدی میری رائے سے فوراً متفق ہو گئے اور ہم میرٹھ جانے کے لیے تھانے سے باہر نکل آئے۔ میں نے ایڈیشنل ایس پی کملیندر پرساد کو تھانے پر ہی رک کر باب الدین کی ایف آئی آر درج کرانے اور اس کے اور مرادنگر تھانے سے بھیجے گئے گھائلوں کے علاج اور حفاظت کا انتظام کرانے کا آدیش دیا اور ضلع مجسٹریٹ نسیم زیدی کی کار میں بیٹھ کر ان کے ساتھ میرٹھ کے لیے روانہ ہو گیا۔

ابھی ہماری گاڑیاں لنک روڈ تھانے کے کیمپس سے باہر نکلی ہی تھیں کہ ضلع مجسٹریٹ کی کار میں لگا وائرلیس سیٹ کھڑکھڑایا۔ ڈسٹرکٹ کنٹرول روم سے ہمارے لیے یہ اطلاع نشر ہو رہی تھی کہ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ دہلی ہوائی اڈے پر پہنچ رہے ہیں اور وہاں سے وہ سیدھے میرٹھ روانہ ہوں گے۔ ان دنوں ایسا اکثر ہوتا تھا کہ وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ

اچانک میرٹھ کا پروگرام بنا لیتے تھے۔ وہ لکھنؤ سے دہلی اتر پردیش سرکار کے ہوائی جہاز سے پالم آتے اور ہوائی اڈے پر ان کا فلیٹ انتظار کرتا رہتا جس پر سوار ہو کر وہ میرٹھ کے لیے روانہ ہو جاتے۔ ان دنوں آج کا گوتم بدھ نگر یا نوئیڈا بھی غازی آباد کا حصہ تھا اور دہلی پرواز کے دوران وزیر اعلیٰ کی حفاظت کی ذمہ داری غازی آباد پولیس کی ہوتی تھی۔ وزیر اعلیٰ کے لیے پانچ چھ کاروں کا ایک فلیٹ ہمیشہ دہلی میں اتر پردیش نواس پر موجود رہتا تھا اور اطلاع ملتے ہی پالم ہوائی اڈہ پہنچ جاتا تھا۔ میرٹھ جیسی ایمرجنسی کم ہی ہوتی تھی اور عموماً وزیر اعلیٰ کی آمد کی پیشگی اطلاع ایک دو دن پہلے ہی وزیر اعلیٰ سیکریٹریٹ سے غازی آباد کے ضلع مجسٹریٹ اور پولیس سپرنٹنڈنٹ کو مل جاتی اور وہ لوگ ہوائی اڈے پر ان کا سواگت کرنے کے لیے موجود رہتے۔ اچانک پروگرام بننے پر یہ ممکن نہیں ہوتا تھا، اس لیے وزیر اعلیٰ کی آمد کی اطلاع ملنے پر فلیٹ اور دہلی میں موجود اتر پردیش سرکار کے افسران ہی ان کا سواگت کرنے کے لیے ہوائی اڈے جاتے۔ آج بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ آج ہم نے وزیر اعلیٰ کو سڑک پر روکنے کا فیصلہ کیا۔ دہلی سے میرٹھ جانے والی سڑک تھانہ لنک روڈ کے سامنے سے گزرتی تھی اور موہن میکنس فیکٹری کے آگے ہنڈن ندی پار کر کے میرٹھ تراہے سے میرٹھ کے لیے مڑتی تھی۔ ہم نے طے کیا کہ میرٹھ تراہے پر روک کر وزیر اعلیٰ کو پورے واقعہ سے آگاہ کرایا جائے۔ ہمارا قافلہ میرٹھ تراہے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ رات کے سناٹے میں ٹریفک سے خالی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی وزیر اعلیٰ کی فلیٹ گھنٹے سوا گھنٹے کے اندر ہمارے قریب آگئی۔ لال نیلی بتیاں دور اندھیرے میں ہی اس بات کا احساس کرانے لگیں کہ تیز رفتار سے دوڑتی ہوئی گاڑیاں کبھی بھی ہمارے پاس پہنچ سکتی ہیں۔ میں جھپٹ کر سڑک کے لگ بھگ بیچوں بیچ پہنچ گیا اور ہاتھ ہلا ہلا کر پائلٹ گاڑی کو رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔ میں وردی میں تھا، وزیر اعلیٰ کی حفاظت سے وابستہ سارا عملہ غازی آباد کا تھا اور مجھے پہچانتا تھا، اس لیے گاڑیاں تیزی سے بریک لگانے کی آوازوں کے ساتھ ایک ایک کر سڑک پر رکیں اور ضلع مجسٹریٹ کے

ساتھ دوڑتا ہوا میں وزیرِاعلیٰ کی گاڑی تک جا پہنچا۔

اپنے مزاج کے مطابق ویر بہادر سنگھ اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر نیم دراز سو رہے تھے۔ ہمارے شیشہ کھٹکھٹانے پر ان کی آنکھ کھلی اور انھوں نے اچکچا کر کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا۔ ضلع مجسٹریٹ اور مجھے دیکھ کر انھیں یہ سمجھ میں آ گیا کہ کوئی گمبھیر مسئلہ ضرور ہوگا، ورنہ آدھی رات کو انھیں بیچ سڑک پر نیند سے جگانے کی گستاخی ہم لوگ نہیں کرتے۔ مجھے یاد نہیں کہ ہم میں سے کس نے کہا لیکن یہ سندیش ضرور ان تک پہنچ گیا کہ کوئی بہت گمبھیر مسئلہ ہے جس پر ہماری ان سے بات چیت بے حد ضروری ہے۔

ان کے اشارے پر ضلع مجسٹریٹ نسیم زیدی داہنی طرف سے جا کر کار میں ان کی بغل میں بیٹھ گئے اور میں ان کے محافظ افسر کو پچھلی کار میں بیٹھنے کا اشارہ کر کے اگلی سیٹ پر اس کی جگہ پر بیٹھ گیا۔ وزیرِاعلیٰ کی کار میرٹھ کی طرف چلی اور انھوں نے سوالیہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا۔ میں منتظر رہا کہ نسیم زیدی انھیں اس بدبختانہ واقعہ کے بارے میں بتائیں گے لیکن جب کچھ دیر تک وہ نہیں بولے تو میری سمجھ میں آ گیا کہ ایک مسلمان افسر کو ایسے حالات میں کس طرح کی کشمکش سے گزرنا پڑتا ہے۔ میں نے سکت بھر اپنے احساسات پر قابو رکھتے ہوئے وزیرِاعلیٰ کو واقعہ کا بیورا دینا شروع کیا۔

میرے حافظے میں وزیرِاعلیٰ کے چہرے پر آنے والے اتار چڑھاؤ ابھی تک صاف صاف مرتسم ہیں۔ پہلے تو ان کے چہرے پر کچھ درج ہی نہیں ہوا سا لگا، لیکن جلد ہی ان کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ جن کا ویر بہادر سنگھ سے نزدیک سے سابقہ پڑا ہے انھیں یاد ہوگا کہ وہ اکثر چھوٹے چھوٹے سوالیہ جملے جلدی جلدی بولتے تھے۔ کئی بار تو ان غیر واضح جملوں کو سمجھنے کے لیے اندازے کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ مجھے صاف یاد ہے کہ اس خبر کو اچھی طرح سمجھتے ہی کہ پی اے سی نے کچھ مسلمانوں کو پکڑ کر مار دیا ہے، وزیرِاعلیٰ کا ردعمل لگ بھگ ہسٹیرکل تھا۔ ان کے منھ سے کئی ٹوٹے ہوئے جملے نکلے لیکن میں ان میں صرف اتنا ہی پکڑ پا رہا تھا کہ بار بار وہ یہ پوچھ رہے تھے کہ پی اے سی نے مسلمانوں کو

کیوں مارا؟ میرے ذریعے دی گئی چھوٹی چھوٹی اطلاعات کو دھیان سے سنتے ہوئے وہ اچانک مشتعل ہو جاتے اور وہی سوال دہراتے جس کا میرے یا ضلع مجسٹریٹ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا: پی اے سی نے انھیں کیوں مارا؟ میرٹھ ترا ہے سے میرٹھ سرکٹ ہاؤس تک پہنچنے کا لگ بھگ ایک گھنٹے کا سفر ایک عجیب تناؤ سے ہو کر گزرا۔ بیچ بیچ میں وزیر اعلیٰ آنکھیں بند کر کے چپ چاپ سیٹ پر سر ٹکا کر خاموشی اختیار کر لیتے۔

میں سمجھ گیا کہ ایک سیاسی مخلوق ہونے کی وجہ سے ویر بہادر سنگھ اس طرح کے قتل عام کا مطلب خوب سمجھ رہے ہیں۔ دہلی کی سرحد پر ہوئے ایسے گھناؤنے کانڈ کو چھپایا نہیں جا سکتا تھا اور خبر ملنے پر وزیر اعظم راجیو گاندھی کا ردعمل کیا ہوگا، اس کا اندازہ بھی آسانی سے لگایا جا سکتا تھا۔ دیش میں رام جنم بھومی آندولن کی وجہ سے فرقہ وارانہ تناؤ ویسے ہی اپنے عروج پر تھا اور کانگریس کافی حد تک دفاعی پوزیشن میں تھی۔ ایسے میں اس خوفناک قتل عام پر مسلمانوں اور راجیو گاندھی کا کیسا ردعمل ہوگا اسے ویر بہادر سنگھ جیسے زمینی نیتا سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا؟ جب وہ یہ سوال بار بار دہراتے کہ پی اے سی نے ایسا کیوں کیا تب ان کے چہرے پر حیرت اور تکلیف کے ساتھ غیر یقینی مستقبل بھی جھلکنے لگتا۔ ان کے ردعمل سے ایک بات تو واضح تھی کہ اس المناک واقعہ کی اطلاع انھیں پہلی بار ہم سے ہی مل رہی تھی۔ میں جان بوجھ کر ویر بہادر سنگھ کے ردعمل کا بیان کر رہا ہوں۔ اس کا جواز قارئین کو آگے کے حالات سے سمجھ میں آئے گا۔

ہاشم پورہ قتل عام کی تفتیش سی آئی ڈی کو سونپی گئی تھی اور شروع میں اس کی کمان جس پولیس سپرنٹنڈنٹ سید خالد رضوی کو سونپی گئی تھی ان سے 2006 میں میری ایک لمبی بات چیت ہوئی جس میں انھوں نے ایک دل چسپ بات بتائی تھی۔ ان کے مطابق پی اے سی کے پلاٹون کمانڈر سریندر پال سنگھ نے ان کے سامنے ایک بار بیان دیا تھا کہ ہاشم پورہ کے مسلمانوں کو سبق سکھانے کا آدیش اسے ویر بہادر سنگھ سے ملا تھا۔ یہ پوچھنے پر کہ اس کی ویر بہادر سنگھ سے کب ملاقات ہوئی اور کب انھوں نے اس طرح کا آدیش اسے دیا، تو

اس نے بتایا کہ ایک بار ویر بہادر سنگھ ہیلی کاپٹر سے میرٹھ آئے تھے، ہیلی پیڈ کی سرکشا ڈیوٹی پر وہ بھی تعینات تھا اور اسی سفر میں ہیلی کاپٹر سے اترنے کے بعد وہ سریندر پال سنگھ کو اشارے سے ایک طرف لے گئے اور انھوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے مسلمانوں کو سبق سکھانے کا آدیش دیا تھا۔ بار بار اس واقعہ کی تاریخ پوچھنے پر وہ یہی کہتا رہا کہ اسے تاریخ یاد نہیں ہے۔ میں نے سی آئی ڈی کے تمام دستاویز کھنگال کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ کیا اس بیان کا ذکر کسی کیس ڈائری میں آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تحریری شکل میں اس بیان کا ذکر کہیں نہیں ملا۔ رضوی کے مطابق انھیں سریندر پال سنگھ کا بیان صرف پیش بندی لگا تھا۔ اکثر مجرمانہ معاملوں میں ملزم کسی بڑے آدمی کا نام اپنے ساتھ معاون ملزم کے روپ میں ملوث کر لیتا ہے تاکہ جانچ افسران اس کے اوپر ہاتھ ڈالنے سے ڈریں۔ رضوی نے درست ہی اس بیان کو مضحکہ خیز مانا تھا کہ وزیر اعلیٰ ہیلی پیڈ پر اترنے کے بعد پلاٹون کمانڈر جیسے جونیئر افسر سے، جس سے ان کے ماضی میں تعلقات کے کوئی ثبوت نہیں تھے، اپنا نام نہاد ایجنڈا لاگو کرنے کا اصرار کرتے۔ یہ بھی فطری تھا کہ سی آئی ڈی نے حکمراں پارٹی کے ایک طاقتور رہنما کے خلاف دیے گئے اس اشتعال انگیز بیان کو تحریراً درج کرنے کی جرأت نہیں کی۔ لیکن نہ تو رضوی کے دل میں کوئی شبہ تھا اور نہ ہی ان سطروں کو لکھتے ہوئے میرے دل میں ہے کہ سریندر پال سنگھ ویر بہادر سنگھ کا نام صرف پیش بندی کے طور پر لے رہا تھا۔

میں ویر بہادر سنگھ کو سنہ 1982 سے دیکھ رہا تھا، جب میں سلطان پور کا پولیس سپرنٹنڈنٹ تھا اور راجیو گاندھی امیٹھی سے الیکشن لڑا کرتے تھے۔ ان دنوں امیٹھی سلطان پور کا ہی حصہ تھا اور راجیو گاندھی کے انتخابی حلقے کے دورے کے دوران وہ پابندی سے موجود رہنے والے اتر پردیش کے منتریوں میں سے ایک تھے۔ وہ زمینی حقائق سے جڑے پریکٹکل نیتا تھے جن کے لیے سیاہ سفید کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ ان کے قریبی لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ ہمیشہ زبانی آدیش دینے میں یقین رکھتے تھے اور عام طور سے کسی کاغذ پر

دستخط کرنے سے بچتے تھے۔ کامیابی حاصل کرنے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ میرا ماننا ہے کہ انھیں جواہر لال نہرو کی روایت کے ان نیتاؤں میں نہیں رکھا جا سکتا جن کے لیے سیکولرزم ایک اصول تھا۔ کانگریس کے بہت سے نیتاؤں کے لیے سیکولرزم ایک سہولت زیادہ ہے اور وہ تب تک سیکولرزم کی باتیں کرتے ہیں جب تک الیکشن میں اس سے انھیں فائدہ پہنچنے کا امکان ہو۔ ویر بہادر سنگھ کو بھی میں اسی درجے میں رکھتا ہوں۔ میرٹھ میں انھیں مسلمانوں کا قتل عام کرا کے کون سا سیاسی فائدہ مل سکتا تھا؟ وہ بھی تب جب کہ دہلی میں راجیو گاندھی کی سرکار تھی اور ان کی شخصیت میں موجود سارے تضادات کے باوجود ان کے سخت ترین نکتہ چیں بھی ان کے اوپر ایسے فرقہ پرستانہ سلوک کا الزام نہیں لگا سکتے تھے جس میں وہ مسلمانوں کی اتنی بڑی کسٹوڈیل کلنگ کو نظر انداز کر دیتے۔

اس کتاب پر کام کرتے وقت مجھے کئی صحافیوں اور سیاسی رہنماؤں نے ڈھکے چھپے یہ اطلاع دینے کی کوشش کی کہ پی اے سی کی بدبختانہ کرتوت کے پیچھے ویر بہادر سنگھ یا چدمبرم کا ہاتھ تھا، جو اس وقت راجیو گاندھی کی کابینہ میں وزیر داخلہ تھے، لیکن جب کوئی مجھے ایسا مشورہ دیتا تو میری آنکھوں کے سامنے ویر بہادر سنگھ کا چہرہ اور اس پر تیرتا ہوا ردعمل گھوم جاتے اور میں کبھی اس امکان پر یقین نہیں کر پایا۔ میرے مذکورہ بالا جملے سے قطعی یہ معنی نہیں نکالے جائیں کہ میرٹھ فسادات کے دوران ویر بہادر سنگھ یا چدمبرم کے رول میں کچھ بھی قابل مذمت نہیں تھا۔ ہاشم پورہ ہو جانے کے بعد ان کے رویوں میں بہت کچھ ایسا تھا جس کی صرف مذمت ہی کی جا سکتی ہے۔ آگے اس پر تفصیل سے لکھوں گا۔

تیزی سے دوڑتی ہوئی گاڑیاں جب ہمیں لے کر میرٹھ سرکٹ ہاؤس پہنچیں، آدھی رات بیت چکی تھی اور تھوڑی ہی دیر میں اگلے دن کا سورج نکلنے والا تھا۔ میرٹھ کے اہم شہری اور پولیس افسران وزیر اعلیٰ کا سواگت کرنے کے لیے وہاں پہلے سے موجود تھے۔ وزیر اعلیٰ کچھ بولے بغیر لگ بھگ دوڑتے ہوئے سرکٹ ہاؤس کے اپنے کمرے کی

طرف بڑھے اوران کے پیچھے پیچھے پولیس اور انتظامیہ کے افسر بھی لپکے۔ وزیراعلیٰ کے سوٹ کے باہر ڈرائنگ روم میں ہم سبھی لوگ بیٹھ گئے اور وزیراعلیٰ اندر اپنی خواب گاہ میں چلے گئے۔

سرکٹ ہاؤس کے ہی ایک کمرے میں پولیس ڈائرکٹر جنرل دیا شنکر بھٹناگر بھی رکے ہوئے تھے۔ غالباً انھیں وزیراعلیٰ کے پروگرام کی اطلاع نہیں دی گئی تھی اس لیے وہ ہمارے بیچ موجود نہیں تھے۔ کسی کو انھیں خبر کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ میں اس کوشش میں تھا کہ وزیراعلیٰ کے اپنے کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے میرٹھ کے ڈی آئی جی رینج اور آئیجی زون کو، اس بھیانک رات میں جو کچھ گزرا تھا، الگ لے جا کر بتا سکوں۔ لیکن مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ سب سے پہلے تو اپنی وردی پیٹی درست کرتے ہوئے پولیس کے ڈائرکٹر جنرل کا داخلہ اس کمرے میں ہوا اور پھر لگ بھگ ساتھ ساتھ ہی وزیراعلیٰ کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ بھی اندر آ گئے۔

وزیراعلیٰ کے آتے ہی سناٹا چھا گیا اور سبھی لوگ گفتگو شروع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ ویر بہادر سنگھ عام طور سے کم بولتے تھے اور میرا اپنا تجربہ یہ کہتا تھا کہ ان کا ہر لفظ کوئی نہ کوئی معنی چھپائے ہوئے ہوتا تھا۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ وہ ایک دو چھوٹے بڑے جملے بول کر سامنے والے کو بولنے کا موقع دیتے تھے۔ آج بھی میری طرح دوسرے افسران یہ انتظار کر رہے تھے کہ وہ کوئی سوال پوچھیں گے اور اس کے جواب میں وہ انھیں اپنی رپورٹ پیش کریں گے۔ یہ فطری تھا کہ آج ان سے میرٹھ کے تازہ ترین حالات کے بارے میں سوال پوچھنے کی توقع کی جا رہی تھی اور میرٹھ کے افسران خود کو جواب دینے کے لیے تیار کر رہے تھے۔ لیکن آج تو ایک غیر فطری سناٹا چھایا ہوا تھا۔

اچانک وزیراعلیٰ نے اپنا راستے والا سوال ایک بار پھر دہرایا..." کیوں مارا پی اے سی نے؟" ایک تو یہ چھوٹا سا سوال انھوں نے اپنے خاص انداز میں اچانک پوچھا تھا اور دوسرے کمرے میں موجود لوگوں میں ان کے علاوہ صرف نسیم زیدی اور میں ہی اس سوال

سے وابستہ سیاق سے واقف تھے، اس لیے یہ فطری ہی تھا کہ میرٹھ کے افسران نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کسی نے کچھ نہیں کہا۔ وزیر اعلیٰ کی نگاہ میرے چہرے پر ٹک گئی اور وہی سوال انھوں نے مجھے دیکھتے ہوئے ایک بار پھر دہرایا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں کمرے میں موجود افسروں کو اس واقعہ کی تفصیلات سے مطلع کروں جس نے انھیں مضطرب کر رکھا تھا۔ کمرے میں موجود سبھی لوگوں کی نگاہیں میرے چہرے پر ٹک گئی اور میں نے اپنی آواز کو ہر ممکن حد تک نارمل بنائے رکھتے ہوئے اختصار سے واقعات کا بیان شروع کیا۔

میرے بولے گئے ایک ایک جملے سے کمرے کا ماحول بوجھل اور زیادہ خاموش ہوتا چلا گیا۔ چار پانچ منٹ بعد ہی جب میں نے اپنی بات ختم کی تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے ایک یگ بیت چکا ہے۔ اس بڑے کمرے کا سناٹا اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ آپ سانسوں کی آوازیں بھی صاف سن سکتے تھے۔ سبھی خاموش تھے اور وزیر اعلیٰ کے ردعمل کے منتظر۔ منجھے ہوئے سیاست داں ویر بہادر سنگھ اپنے مزاج کے مطابق چپ تھے اور دوسروں کو بولتے ہوئے سننا چاہتے تھے۔ انھوں نے پھر وہی چھوٹا سوال داغا... ''پی اے سی نے مارا کیوں؟'' اور خاموش ہو گئے۔

اس کے بعد اس کمرے میں اگلے دو تین گھنٹوں کے دوران جو کچھ ہوا وہ کسی المیہ ڈرامے سے کم نہیں تھا۔ ہندوستانی نوکر شاہی کی روایت کے مطابق خوشامد، موقع پرستی اور اپنی کھال بچاتے ہوئے دوسروں پر ذمہ داریاں ڈالنے کا ایک دلچسپ کھیل شروع ہوا جس میں اپنے چھوٹے چھوٹے جملوں کے ساتھ وزیر اعلیٰ تھے اور ان جملوں میں چھپے معنی کو پکڑ کر لمبی لمبی دلیلیں دینے والے نوکر شاہ، جو لگاتار اپنے لمبے چھوٹے جملوں کا اثر کنکھیوں سے وزیر اعلیٰ کے چہرے پر بھانپنے میں مشغول تھے۔ ایک بات سب کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ جو کچھ ہوا ہے وہ سیاسی روپ سے وزیر اعلیٰ کے لیے نقصان دہ ہونے والا ہے اور اس مصیبت سے وزیر اعلیٰ کو بچانا ان کا اعلیٰ ترین فریضہ ہے۔

پچیس سال سے زیادہ ہو گئے ہیں اس گفتگو کو، اس لیے یہ توقع کرنا تو مناسب نہیں ہوگا کہ میں وہاں ہوئی گفتگو کو لفظ بہ لفظ یہاں پیش کرسکوں لیکن اس کمرے میں چل رہی بات چیت کی مرکزی تشویش مجھے اب تک یاد ہے۔ سب سے پہلے جو سوال مجھ سے پوچھے گئے ان کا مفہوم یہ تھا کہ میں یقین کے ساتھ کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ جنھوں نے اس واردات کو انجام دیا وہ پی اے سی کے لوگ ہی تھے؟... باب الدین کی بات پر کیسے یقین کیا جاسکتا ہے؟... کیا وہ پولیس اور فوج کا فرق سمجھتا ہے؟... اگر ہاشم پورہ سے اتنی بڑی تعداد میں لوگ اٹھائے گئے تھے تو آٹھ دس گھنٹے ہو جانے کے بعد بھی اب تک وہاں سے کوئی شکایت درج کرانے کیوں نہیں آیا؟ میرے یہ کہنے پر کہ اس واردات میں پی اے سی کے ملوث ہونے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ خود تھانہ سپرنٹنڈنٹ لنک روڈ، وی بی سنگھ نے پی اے سی کے ٹرک کو جائے واردات سے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا اور میں نے اور ضلع مجسٹریٹ نے بھی پی اے سی کی اکتالیسویں بٹالین کے کیمپس میں جا کر کافی ثبوت پائے تھے جس سے ان کا اس معاملے میں ملوث ہونا بلاشبہ ثابت ہوتا ہے، سوال پوچھنے والا پینترا بدل دیتا اور کوئی دوسرا سوال داغ دیتا لیکن میں دھیرج کھوئے بغیر جواب دیتا رہا۔

یہ پا کر کہ پی اے سی کے رول کو لے کر میرے دل میں کوئی شک نہیں ہے، کسی نے مجھ سے پوچھا کہ اب کیا کیا جانا چاہیے؟ میرا جواب بڑا سپاٹ تھا کہ اکتالیسویں بٹالین کا جو ٹرک اس واردات میں ملوث تھا اس پر سوار لوگ اسے بٹالین میں دھونے کے بعد میرٹھ واپس بھاگے تھے اگر ہم چاہیں تو اب بھی ان لوگوں کو ٹرک کے ساتھ پکڑ سکتے ہیں کیونکہ وہ کچھ ہی دیر پہلے اپنے کیمپنگ ایریا میں پہنچے ہوں گے اور انھیں اس بات کا بہت کم اندیشہ ہوگا کہ اتنی جلدی انھیں پکڑنے کی کوشش ہو سکتی ہے۔

یہ فطری تھا کہ میری اس تجویز پر کمرے میں سناٹا کھنچ گیا۔ کوئی بھی جوکھم اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ شہر میں تیس کے لگ بھگ پی اے سی کی کمپنیاں تعینات تھیں اور کمرے

میں موجود زیادہ تر لوگوں کے ذہن میں 1973 کی پی اے سی کی بغاوت کی یادیں موجود تھیں۔ پی اے سی کے عملے کے کیمپ پر چھاپہ مارنے اور ان کی گرفتاری کی کوشش پر شہر میں موجود دوسرے پی اے سی عملے پر کیا ردعمل ہوگا اس کے بارے میں کوئی بھی مطمئن نہیں تھا۔ پتا نہیں یہ پی اے سی کے منفی ردعمل کا خدشہ تھا یا ان کے دلوں میں دبی ڈھکی یہ بھاونا کہ مسلمانوں کو ایسا سبق سکھایا ہی جانا چاہیے، کہ کسی نے بھی میری تجویز کی حمایت نہیں کی اور سبھی اپنی چھوٹے بڑے تبصروں سے وزیر اعلیٰ کو پی اے سی کے ممکنہ منفی ردعمل سے ڈراتے رہے۔ یہ فطری تھا کہ سیاست کے زمینی حقائق سے جڑے ویر بہادر سنگھ کو یہ آسانی سے سمجھ میں آ گیا کہ ایسے وقت میں جب کہ صوبہ فرقہ پرستی کی آگ میں جھلس رہا ہے، پی اے سی کی بغاوت جیسی صورتِ حال ان کی آخری خواہش ہوگی۔ میں نے ہمت کر کے وزیر اعلیٰ سے یہ درخواست کی کہ میرٹھ ایک بڑی چھاونی ہے اور ہمیں ضرورت پڑنے پر فوج کو بھی مدد کے لیے بلانے سے نہیں ہچکچانا چاہیے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وزیر اعلیٰ کے جذبات سے عاری چہرے نے میری اس تجویز پر کوئی توجہ نہیں دی۔

جلد ہی اس بڑے کمرے میں چھوٹے چھوٹے گروہ بن گئے اور انھوں نے امکانات پر باتیں کرنی شروع کر دیں۔ نوکر شاہی کے باطنی اوصاف کے عین مطابق وہاں موجود افسران میں سب کی فکر کا مرکز ایک ہی موضوع تھا کہ کیسے اس مصیبت سے نجات پائی جائے۔ بار بار ان گروہوں کے شرکا میں سے کسی ایک کی آنکھ یا ہاتھ کا اشارہ ملتا اور مجھے ان کے سوچ بچار کا حصہ بننے کا موقع ملتا۔ میں جتنا کچھ نوکر شاہی کے کردار کو جانتا تھا اس سے مجھے ذرا بھی تعجب نہیں ہو رہا تھا کہ وہاں موجود کسی بھی شخص کو آزادی کے بعد کی سب سے بڑی کسٹوڈیل کلنگ میں کوئی بھی آئینی، قانونی یا اخلاقی ذمہ داری کا احساس نہیں ہو رہا تھا اور کوئی بھی وزیر اعلیٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اگر کوئی پلٹن غیر قانونی کام کرنے سے روکنے پر بغاوت کو اتارو ہو جائے تو اس بغاوت کو سختی سے کچل دینا چاہیے۔ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں جن

امکانات پر سوچ بچار ہو رہا تھا وہ صرف اسی تشویش کے ارد گرد گھوم رہے تھے کہ کیسے اگلے دن سورج نکلنے کے بعد دنیا کو اس سنگین قتل عام کی اطلاع ملنے سے روکا جائے۔

میں صاف طور پر تو نہیں یاد کر پا رہا ہوں کہ کس گروہ میں کون کون سے افسر تھے یا کون سی تجویز کس شخص کے ذریعے پیش کی گئی لیکن مجھے تجویزوں کی منشا ابھی تک یاد ہے۔ مثلاً کئی بار گھما پھرا کر اور کئی بار بہت صاف لفظوں میں یہ کہا گیا کہ لاشیں نہر میں بہہ سکتی ہیں۔ میرٹھ کے ہی ملیانہ محلے میں یہ ہوا بھی تھا کہ وہاں مارے گئے زیادہ تر مسلمانوں کی لاشیں گنگ نہر میں بہادی گئیں۔ ایک ڈھیٹ تجویز یہ بھی تھی کہ جیسے اتنے لوگ مرے ہیں ویسے ہی پولیس کی حفاظت میں موجود تینوں لوگ بھی مر سکتے ہیں۔ اس تجویز میں پوشیدہ معنی یہ تھے کہ ان تینوں کو بھی مار کر نہر میں بہا دیا جائے۔ وہاں موجود میرے اور ضلع مجسٹریٹ نسیم زیدی سمیت کسی کو بھی یہ نہیں معلوم تھا کہ تین زندہ بچ گئے لوگوں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو پی اے سی کے چنگل سے بچ نکلے ہیں، اور ان میں سے ایک ذوالفقار ناصر تو اگلے کچھ گھنٹوں میں ہی اخبار والوں کے سامنے پیش بھی کیا جانے والا ہے۔

آج جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ اس بھیانک تجویز کو نہ مان کر ہم نے کتنی بڑی ذلت سے خود کو بچا لیا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور سورج طلوع ہونے والا تھا۔ میں نے اور نسیم زیدی نے اس گہما گہمی کے دوران ایک کونے میں جا کر آپس میں بات کی اور دونوں کی رائے یہی ہوئی کہ ہم اور زیادہ تاخیر نہیں کر سکتے۔ دن نکلتے ہی غازی آباد میں بیتی رات کی خوفناک واردات زبان زدِ عام ہو جائے گی اور خاص طور سے لاشوں کے مار چری پہنچنے پر غازی آباد کی بڑی مسلم آبادی کو بے قابو ہونے سے روکنا مشکل ہو جائے گا۔ میرٹھ کی خبریں مرچ مسالہ لگا کر دونوں فرقوں کے بیچ پہنچ رہی تھیں اور ہمارا گزشتہ ہر دن کچھ نہ کچھ برا ہونے کے خدشے میں گزرا تھا۔ ایسے میں اگر ہم میرٹھ میں ہی پھنسے رہے تو غازی آباد کو بچانا زیادہ مشکل ہوتا جائے گا۔ لیکن یہ بات وزیر اعلیٰ تک کیسے پہنچائی جائے؟

میں نے ایک چھوٹے سے گروہ میں کھڑے میرٹھ کے آئی جی زون، ایس کے مکھر جی کو آنکھ سے اشارہ کیا اور وہ میرا اشارہ سمجھ کر ایک کونے میں چلے آئے۔ میں انھیں میرٹھ کے پولیس افسروں میں کافی حساس مانتا تھا اور ان کے سامنے اپنے دل کی بات رکھنے میں کبھی تامل نہیں کرتا تھا۔ میں نے انھیں جو کچھ بتایا اس کی مراد یہ تھی کہ نہ تو لاشیں نہر میں بہائی جاسکتی ہیں اور نہ ہی پولیس تحفظ میں موجود کسی شخص کو مارا جاسکتا ہے۔ ان سب کاموں کے لیے سرکار کو غازی آباد میں کسی نئے پولیس سپرنٹنڈنٹ کا تقرر کرنا پڑے گا۔ میں نے ان سے ایک جھوٹ ضرور بولا کہ تھانہ لنک روڈ پر موجود ایڈیشنل ایس پی کملیندر پرساد نے اس معاملے میں باب الدین کی ایف آئی آر بھی درج کرادی ہے۔ حالانکہ تب تک مجھے کملیندر پرساد سے اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ میں نے یہ بھی واضح کردیا کہ اب غازی آباد کے ضلع مجسٹریٹ اور پولیس سپرنٹنڈنٹ کو زیادہ دیر تک میرٹھ میں روکنے کے نتیجے میں غازی آباد جل سکتا ہے۔

میں ان کے چہرے کو دھیان سے دیکھ رہا تھا، اور میں سمجھ گیا کہ وہ کافی حد تک میری بات سے متفق ہیں۔ مجھے چھوڑ کر وہ سیدھے وزیر اعلیٰ کی طرف گئے جو تب تک اپنے کمرے میں جاچکے تھے۔ آئی جی زون بند دروازہ کھولتے ہوئے ان کے کمرے میں گھسے اور جیسا کہ میں توقع کررہا تھا، تھوڑی ہی دیر میں وہاں سے میرا بلاوا آ گیا۔ میں اور ضلع مجسٹریٹ لپکتے ہوئے کمرے میں گھس گئے جہاں تین چار لوگ کرسیوں پر بیٹھے یا کھڑے بستر پر نیم دراز وزیر اعلیٰ سے بات کر رہے تھے۔ کمرے کے ماحول میں تناؤ ضرور تھا لیکن وزیر اعلیٰ کا بولنا شروع کرتے ہی میں یہ سمجھ گیا کہ آئی جی زون نے میری بات اچھی طرح سے انھیں سمجھا دی ہے اور وہ بھی یہ مان چکے ہیں کہ اس پورے معاملے میں ہمارے پاس کارروائی کرنے کے سوا دوسرا متبادل نہیں ہے۔

اپنے خاص انداز میں ویر بہادر سنگھ نے جو کچھ کہا اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ ہمیں فوراً غازی آباد روانہ ہو جانا چاہیے اور وہاں جو بھی کارروائی ضروری ہے، بلا تاخیر پوری

کرنی چاہیے۔ آخر میں آیا یہ واضح حکم کہ وہ غازی آباد کا امن غارت ہونا برداشت نہیں کریں گے۔ میں بھی تو یہی چاہتا تھا!

کمرے سے باہر نکل کر سب سے پہلے میں نے ڈی آئی جی رینج نتھو لال کو ایک کنارے لے جا کر وزیر اعلیٰ کے ساتھ ہوئی مختصر بات چیت سے باخبر کیا، انھوں نے بھی مجھے کچھ ضروری مشورے اور ہدایتیں دیں اور غازی آباد روانہ ہونے کے لیے کہا۔ تبھی اندر سے سندیش آیا کہ وزیر اعلیٰ نے ضلع مجسٹریٹ کو کچھ دیر اور رکنے کے لیے کہا ہے، اس لیے انھیں وہیں چھوڑ کر میں باہر نکل آیا۔ باہر سورج نکل چکا تھا اور ابھی تک اس کی کرنوں میں مئی کی تلخی نہیں آئی تھی۔ میرٹھ کے لمبے چوڑے سرکٹ ہاؤس کا کیمپس پرانے اور گھنے درختوں سے بھرا ہوا تھا اور مند مند بہنے والی ٹھنڈی ہوا میں رات کا تناؤ اور امس غائب تھی۔

میں نے باہر پورٹیکو میں چند منٹ ہی انتظار کیا ہوگا کہ میرے ڈرائیور نے کار لا کر وہاں لگا دی۔ وقت گنوانے کا کوئی مطلب نہیں تھا، میں کار میں بیٹھا اور غازی آباد کے لیے روانہ ہو گیا۔ کار کے چلتے ہی سب سے پہلے میں نے وائرلیس سے تھانہ لنک روڈ اور مرادنگر سے بات کی اور یہ پتا چل گیا کہ دونوں تھانوں پر متعلقہ مقدمے قائم ہو گئے ہیں۔ میں نے پچھلی سیٹ سے اپنا سر ٹکا لیا اور چپ چاپ آنکھیں بند کر پچھلی رات کے تناؤ اور نیند کے فقدان سے نجات پانے کی کوشش کرنے لگا۔ کار تیزی کے ساتھ میرٹھ سے غازی آباد کی سڑک پر دوڑنے لگی۔

درد سے سر پھٹا جا رہا تھا لیکن آرام کرنے کا وقت نہیں تھا۔ راستے میں ہی مجھے وائرلیس سے پیغام مل گیا تھا کہ دونوں جائے واردات سے لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے مارچری روانہ ہونے لگی ہیں۔ شہر کے نزدیک آنے پر میں نے ڈرائیور سے سیدھے مارچری چلنے کے لیے کہا۔ ہنڈن ندی کے ساحل پر واقع مارچری پر ابھی تک پہلی لاش نہیں پہنچی تھی۔ مقامی تھانے کی ایک چھوٹی سی ٹکڑی وہاں پہنچ چکی تھی۔ آس پاس کھڑے

لوگوں کے بھینچے چہروں پر تناؤ اور تکلیف صاف صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ آج تو ہنڈن ندی کے ساحل تک آبادی ہے لیکن ان دنوں میرٹھ ترا ہے کے بعد ندی تک کوئی آبادی نہیں تھی اور ندی کے دوسرے ساحل پر بھی موہن میکنس فیکٹری تک عمارتیں بھی نہیں بنی تھیں۔

مارچری، اتر پردیش کے دیگر ضلع ہیڈ کوارٹروں کی ہی طرح یہاں بھی دو ڈھائی کمروں اور ایک برآمدے کی بدرنگ خستہ حال عمارت تھی جس کے ارد گرد بڑھی ہوئی جھاڑیوں اور کوڑے کچرے کے ڈھیر کے بیچ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ دیکھ کر صاف سمجھ میں آرہا تھا کہ نہروں کے کنارے لاشوں کے ملنے کی خبر شہر کے مسلم علاقوں میں پہنچ چکی تھی اور دکھی اور مشتعل مسلمان سچائی جاننے کی غرض سے وہاں آنے لگے تھے۔ میری گاڑی رکتے ہی کچھ لوگ ادھر کو لپکے۔ وہاں موجود پولیس والوں نے انھیں قابو میں کیا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ ہوا کیا ہے اور میرے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اتنا بھیانک تھا اور میرے پاس اب بھی ساری اطلاعات نہیں تھیں، اس لیے کچھ بھی بولنا خطرناک تھا۔ میں جنتا سے بچتا رہا اور وہاں موجود پولیس کرمیوں کو ضروری ہدایات دیتا ہوا اپنی رہائش گاہ، پولیس سپرنٹنڈنٹ نواس کی طرف روانہ ہو گیا۔

نینداور تھکن کا مارا بدن آرام مانگ رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ میں نے وائرلیس آپریٹر سے ضلعے کے حساس تھانوں کے تھانیداروں کو بنگلے پر ایک گھنٹے بعد پہنچنے کا پیغام نشر کرنے کا حکم دیا اور خود ایڈیشنل ایس پی سے ٹیلیفون پر بات چیت میں مصروف ہو گیا۔ انھیں لوکل انٹیلی جینس افسران اور پولیس ڈپٹی سپرنٹنڈنٹس کو لے کر آنے کے لیے کہہ کر میں غسل خانے میں گھس گیا۔ اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے ہم نے مغز ماری کی اور ضلعے میں فراہم فورس کو حساس علاقوں میں تعینات کرنے کی یوجنا بنا کر، نیز ایک بار شہر کی صورتِ حال کا جائزہ لے کر ہی اٹھے۔ میں دیکھ رہا تھا کی کسی کو بھی پچھلی

رات پوری نیند نہیں ملی تھی اور ہر کسی کی آنکھیں بیچ بیچ میں بند ہو جاتی تھیں، لیکن کوئی چارا نہیں تھا۔ سب کچھ نمٹا کر مجھے لگا کہ تھوڑی پیٹ پوجا کر کے مجھے بھی ایک نیند لے لینی چاہیے۔ اب بدن اور دماغ دونوں ساتھ دینے سے انکار کر رہے تھے۔

دیر شام تک میں سوتا رہا اور جب اٹھا تو باہر چارح تاریکی پھیل چکی تھی۔ اگلے کچھ گھنٹوں تک میں شہر کے حالات کی خبریں لیتا رہا۔ یہ ضرور سمجھ میں آیا کہ جو مقدمے لنک روڑ اور مرادنگر تھانوں پر درج ہوے تھے ان پر دھیان دینے کا وقت کسی کے پاس نہیں تھا۔ جب جب میں نے دونوں تھانیداروں سے بات کی مجھے یہی پتا چلا کہ وہ اور ان کے تھانوں کی پوری فورس لاشوں کے پوسٹ مارٹم، انھیں دفنانے اور اپنے اپنے علاقوں میں امن قائم کرنے جیسے کاموں میں مصروف رہے۔ یہ صحیح بھی تھا، اس لیے میں نے انھیں چھیڑا نہیں۔

❁ ❁ ❁

حواشی:

ا۔ 1973 میں بھارت کی کئی مرکزی اور صوبائی پولیس فورسز نے بغاوت کی تھی۔ بغاوت کے پیچھے بنیادی مطالبات میں سے ایک یونین بنانے کے حق سے متعلق تھی۔ پی اے سی کی بغاوت کو کچلنے کے لیے فوج بلانی پڑی تھی، اور اس کارروائی میں دونوں طرف کے کافی لوگ مارے گئے اور گھائل ہوے تھے۔ بڑی تعداد میں پی اے سی کا عملہ برخاست کیا گیا اور ان پر مقدمے چلائے گئے تھے۔

5

کچھ روشنی باقی تو ہے، ہر چند کہ کم ہے

اگلا دن یعنی 24 مئی 1987۔ دوپہر کا ایک بجا ہوگا، میں اپنے دفتر میں بیٹھ کر اپر پولیس سپرنٹنڈنٹ کملیندر پرساد اور لوکل انٹیلی جینس یونٹ اور اسپیشل برانچ کے افسروں سے ہاشم پورہ کی واردات کے غازی آباد پر پڑنے والے اثرات کے بارے میں تبادلۂ خیال کر رہا تھا کہ تبھی ضلع مجسٹریٹ نسیم زیدی کا فون آیا کہ وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ میرٹھ سے غازی آباد پہنچ رہے ہیں۔ وہ میرٹھ میں ہی رکے تھے اور وہیں سے آ رہے تھے۔ جب ہمیں یہ اطلاع دی گئی، ان کا ہیلی کاپٹر اڑنے ہی والا تھا۔ میرٹھ پولیس کی طرف سے خبر آئی کہ ان کے ساتھ پولیس ڈائرکٹر جنرل دیا شنکر بھٹناگر بھی آئیں گے۔

ہمارے پاس وقت بہت کم تھا اور ہم تیزی کے ساتھ پولیس لائنس میں واقع ہیلی پیڈ کی طرف بھاگے۔ لگ بھگ اڑتالیس گھنٹے ہو گئے تھے اور ہم میں سے کوئی بھی پوری نیند نہیں سویا تھا۔ مرادنگر اور مکن پور سے پہنچی لاشوں کے پوسٹ مارٹم ہو چکے تھے اور پچھلی رات انھیں دفن بھی کیا جا چکا تھا۔ غازی آباد حالانکہ میرٹھ جیسا حساس نہیں تھا اور نہ ہی یہاں میرٹھ کی طرح مستقل ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کی کوئی تاریخ تھی لیکن پھر بھی پچھلے دو دنوں سے شہر کی فضا میں جو بدلاؤ آ رہا تھا اس سے ہم بھی یہ جانتے تھے غازی

آباد کبھی بھی میرٹھ کے راستے جا سکتا ہے۔ جب سے میرٹھ میں دنگے شروع ہوے تھے غازی آباد افواہوں میں جھوم رہا تھا اور ہمارے لیے اسے شانت رکھنا ایک بڑے امتحان کی طرح تھا۔ کوڑھ میں کھاج یہ تھی کہ ہماری اپنی پولیس فورس کا کافی بڑا حصہ میرٹھ جا چکا تھا، باہر سے کوئی ایڈیشنل فورس ملنا تو دور، اپنی پولیس فورس کو میرٹھ سے واپس بلا پانے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے 22/23 تاریخ کی رات میرٹھ سرکٹ ہاؤس میں موجود پولیس ڈائرکٹر جنرل دیاشنکر بھٹناگر کو یہ بات بتائی بھی تھی لیکن ان کی جھڑکی کھا کر چپ رہ گیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ اس وقت سب کا دھیان میرٹھ پر ہے اور وہاں سے نکال کر ایک بھی آدمی غازی آباد بھیجنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوگا۔ ہمیں غازی آباد اپنے محدود وسائل سے ہی بچانا تھا۔

دفتر سے نکلتے نکلتے میں نے اپنے پیشکار کو حکم دیا کہ وہ ہاشم پورہ کانڈ کے تفتیش کار، لنک روڈ اور مرادنگر کے تھانیداروں کو بھی پولیس لائن پہنچنے کے لیے کہے۔ مجھے امید تھی کہ وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ دونوں تھانوں پر درج مقدموں کی تفتیش کے ڈیولپمنٹ کے بارے میں بھی جاننا چاہیں گے۔ حالانکہ مجھے پتا تھا کہ 36 گھنٹے پہلے درج ان مقدموں کے سوچ بچار میں ابھی تک کچھ خاص نہیں ہوا تھا۔ دونوں تھانیدار ایف آئی آر درج ہونے کے بعد سے لاشوں کو نہر سے نکالنے، ان کے پنچ نامہ کرانے، انھیں پوسٹ مارٹم کے لیے مارچری لے جانے اور پوسٹ مارٹم کے بعد دفنانے اور ان سب کے ساتھ اپنے اپنے علاقوں میں امن بنائے رکھنے کے کام میں اتنے مشغول رہے تھے۔ انھوں نے تفتیش میں کچھ خاص کیا ہوگا، اس کی امید مجھے نہیں تھی۔ ہر دو تین گھنٹے بعد میری ان سے بات چیت ہوتی رہی تھی اور مجھے پتا تھا کہ اس وقت تفتیش میں مشغول ہونے سے زیادہ ضروری امن قائم رکھنا تھا، اس لیے میں نے بھی ان سے اس بارے میں زیادہ پوچھ تاچھ نہیں کی تھی۔ میں نے انھیں صرف اس لیے پولیس لائن پہنچنے کا آدیش دیا کہ اگر وزیر اعلیٰ دونوں وارداتوں کے بارے میں کچھ ایسی جانکاری مانگیں جو میرے پاس نہ ہو تو میں ان

کی مدد لے سکوں۔

غازی آباد پولیس لائن ابھی بن ہی رہی تھی۔ کئی عمارتوں پر تعمیراتی کام چل رہا تھا اور سڑکوں کے کنارے لگائے گئے درخت اپنی زندگی کے عہدِ طفلی میں تھے۔ پریڈ گراؤنڈ ایک چورس میدان کی طرح پھیلا ہوا تھا اور آج جہاں سٹیڈیم دکھائی دیتا ہے وہاں صرف کچھ سیڑھیاں تھیں جن پر سیریمونیل پریڈ یا کسی دوسرے پروگرام کے دوران شامیانہ لگا دیا جاتا تھا۔ اسی میدان میں ہم دس بارہ لوگ کھڑے ہوکر آکاش کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ اچانک دور پھڑ پھڑاتے ڈینوں کے ساتھ ایک چیل دکھائی دی۔ شروع میں ٹھہری ہوئی سی لگی، لیکن اچانک تیز رفتار سے ہماری طرف جھپٹی۔ میدان کے کنارے کھڑے جوانوں نے اسموک کینڈل جلا دی۔ دھواں اوپر کو اٹھا ہی تھا کہ ہیلی کاپٹر ہمارے سر پر منڈلانے لگا۔ وہ چنگھاڑتا ہوا، نیز دھول اور ہوا کے دباؤ سے ہمیں جھنجھوڑتا ہوا ہیلی پیڈ کے دائرے کے اندر لکھے 'H' حرف پر اتر کر اپنے پہیوں پر کھڑا ہو گیا۔ جب اس کے ڈینے پوری طرح ٹھہر گئے، ضلع مجسٹریٹ نسیم زیدی کے ساتھ میں بھی آنے والوں کا سواگت کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ ہیلی کاپٹر میں سے پہلے ایک ٹیکنیشین باہر نکلا اور اس نے پائلٹ کے بائیں طرف اگلی سیٹ کا دروازہ کھینچ کر کھول دیا۔ سب سے پہلے وزیراعلیٰ ویر بہادر سنگھ باہر نکلے، پھر پچھلی سیٹ سے پولیس ڈائرکٹر جنرل دیا شنکر بھٹناگر اور ایک اور افسر اترے جن کا نام میں بہت کوشش کرنے پر بھی یاد نہیں کر پا رہا ہوں۔

وزیراعلیٰ اور ان کے ساتھ آئے لوگوں کے چہرے پر تناؤ کی لائنیں بڑی صاف دکھائی دے رہیں تھیں۔ وزیراعلیٰ نے ہمارے ابھیوادن (سلام) کا جواب دیا اور انتظار میں کھڑی اپنی کار کی طرف بڑھے۔ اچانک وہ ٹھٹکے، وہاں کھڑے دوسرے افسروں کی بھیڑ میں سے ریزرو انسپکٹر برج راج سنگھ سسودیا کو اشارہ کیا، اور قریب آنے پر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے ایک طرف کو لے گئے۔ ریزرو انسپکٹر پولیس لائن کا انچارج ہوتا ہے۔

جو لوگ اتر پردیش میں ذات پات کی حقیقت جانتے ہیں، انھیں یہ جان کر کوئی تعجب نہیں ہوگا کہ وزیر اعلیٰ نے تمام سینئر شہریوں اور پولیس افسروں کو چھوڑ کر ایک جونیئر افسر سے تنہائی میں جا کر الگ سے بات کی۔ سسودیا ویر بہادر سنگھ کی ذات کا تھا اور ان کا بہت نزدیکی تھا۔ مجھے پتا تھا کہ وزیر اعلیٰ غازی آباد اور آس پاس کے علاقے کی جانکاریاں حاصل کرنے کے لیے سرکاری چینلوں کے علاوہ کچھ غیر رسمی چینل بھی استعمال کرتے تھے اور سسودیا ان میں سے ایک تھا۔ سسودیا میرا بھی وفادار تھا اور اس کے ذریعے کئی بار وزیر اعلیٰ کے دل میں کیا کچھ پک رہا ہے اس کی جانکاری مجھے ملتی رہتی تھی۔ میرٹھ کے فسادات کے دوران اکثر وزیر اعلیٰ دہلی یا میرٹھ میں آ کر پڑے رہتے تھے اور سسودیا ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔ لوٹ کر مجھے اس کے منھ سے بہت سی ایسی جانکاریاں حاصل ہوتی تھیں جن کا آفیشیل دستاویزوں میں کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔

اچانک وزیر اعلیٰ بات چیت ختم کر کے مڑے اور اپنی کار کی طرف بڑھے۔ سسودیا میری طرف دوڑتا ہوا آیا اور اس سے مجھے معلوم ہوا کہ وزیر اعلیٰ پولیس لائن کے اردلی روم میں جائیں گے۔ اردلی روم تھوڑی ہی دور پر تھا اور میں نے سسودیا کو بھاگ کر وہاں پہنچنے کا آدیش دیا۔ ہم سب کو لیے ہوئے گاڑیوں کا قافلہ ایک گھماؤدار سڑک سے جب تک وہاں پہنچا، سسودیا اور اس کے کچھ رفقائے کار میدان سے دوڑتے ہوئے ایک چھوٹے راستے سے ہو کر وزیر اعلیٰ کا سواگت کرنے کے لیے وہاں پہنچ چکے تھے۔ اردلی روم دراصل پولیس لائن کے انچارج، ریزرو انسپکٹر کا دفتر ہوتا ہے جہاں انگریزوں کے زمانے سے چلی آ رہی روایت کے مطابق ہرے میز پوش والی میز کے پیچھے بیٹھ کر پولیس کے سینئر افسران جوانوں کو ان کی چھوٹی موٹی غلطیوں کے لیے معمولی سزائیں سناتے ہیں۔ اس سہ پہر دو گھنٹے سے زیادہ چلے سوچ بچار کے دوران، جس میں وزیر اعلیٰ اور ان کے ساتھ آئے اعلیٰ افسران کے علاوہ میں اور ضلع مجسٹریٹ نسیم زیدی بھی موجود تھے، کافی کچھ ایسا واقع ہوا جس کی وجہ سے مجھے لگنے لگا کہ اگر میں نے رازداری کی برطانوی چادر

اپنے سر سے نہیں اتار پھینکی تو ہاشم پورہ کسی اندھی سرنگ میں سما جائے گا اور دیش میں آزادی کے بعد کی سب سے بڑی کسٹوڈیل کلنگ کا راز جنتا کے پاس پہنچنے کے پہلے ہی بستۂ خاموشی میں دفن ہو جائے گا۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ اور بے میل بات یہ تھی کی اردلی روم میں چل رہی بحث تمام موضوعات پر ہو رہی تھی لیکن اس میں پی اے سی کے مجرم عملے کے خلاف سرعت سے بروقت کارروائی کرنے کا ذکر کہیں نہیں تھا۔ یہ تکلیف دہ اس لیے تھا کی ہر بھاگتے لمحے کے ساتھ اس گھناؤنے قتل عام کے مجرموں کو ثبوت مٹانے کا وقت ملتا جا رہا تھا۔ اور بعد میں وہ سبھی بچے بھی اسی لیے کہ انھیں کنٹرول کرنے والی سرکار اپنے ہی اوڑھے ہوئے تخیلی خوف کے خول میں بے عمل بیٹھی رہی۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ یہ سب اس کمرے میں ہو رہا تھا جو مجرموں کو سزا دینے کے لیے بنا تھا۔

مجھے اب تک یاد ہے کہ ویر بہادر سنگھ جیسا زمینی حقائق سے وابستہ نیتا پوری بات چیت کے دوران بڑی شدت سے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پی اے سی ڈسپلن سے اتنی باہر کیسے ہو گئی تھی کہ ڈھیروں بے گناہ لوگوں کو پکڑ کر لے گئی اور انتہائی بے رحم طریقے سے انھیں مار ڈالا؟ پولیس ڈائرکٹر جنرل دیا شنکر بھٹناگر انھیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ پی اے سی کا ضرورت سے زیادہ استعمال اور ٹریننگ کا مکمل فقدان اس صورتِ حال کے ذمہ دار ہیں۔ سبھی جانتے تھے کہ دیا شنکر بھٹناگر نے ڈائرکٹر جنرل بنتے ہی صوبے بھر میں تعینات پی اے سی کی تمام کمپنیوں کو ٹریننگ کے لیے واپس ان کی پلٹنوں میں بلا لیا تھا۔ اس وقت تک اتر پردیش پولیس میں ان کے مخالفوں اور میرٹھ کی ناکامی کے ذمہ دار افسروں نے یہ کہنا بھی شروع کر دیا تھا کہ میرٹھ میں دنگوں کے بھڑکنے اور بے قابو ہونے کے پیچھے دیا شنکر بھٹناگر کا وہ آدیش تھا جس کی وجہ سے میرٹھ میں عام طور سے فراہم رہنے والی پی اے سی کی زیادہ تر کمپنیاں ٹریننگ کے لیے اپنے اپنے بیرکوں میں واپس جا چکی تھیں۔

میں بھانپ سکتا تھا کہ بھٹناگر کا بار بار ٹریننگ کی اہمیت کو خط کشید کرنا شاید اس لازمی

مصیبت سے بچنے کی کوشش تھی جو میرٹھ دنگوں کے ختم ہونے کے بعد ان کے اوپر ٹوٹنے والی تھی۔ بھٹناگر کی گنتی کبھی بھی کامیاب پیشہ ور پولیس افسروں میں نہیں ہوتی تھی اور وہ اپنی بدزبانی، چڑچڑے پن اور غیر عملی ضد کے لیے ہی زیادہ جانے جاتے تھے۔ یہ بات الگ ہے کہ ان کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی اور میرٹھ کے دنگوں کی بجلی ان کے اوپر گری اور وہ جلد ہی ہٹا دیے گئے۔

کمرے میں بیٹھے لوگ ہاشم پورہ کی وجوہات پر اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔ میں متعجب تھا کہ کوئی بھی واردات کی ان بنیادی وجوہ پر بات نہیں کر رہا تھا جو ہاشم پورہ جیسے گھناونی وارداتوں کے لیے ذمہ دار ہیں۔ لگ بھگ ہر دنگے میں جہاں پی اے سی کا استعمال کیا گیا، اس کے اوپر فرقہ پرستی کے الزام لگے ہیں۔ کبھی بھی سیاست یا پولیس کی چوٹی کی لیڈرشپ نے ان وجوہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی گمبھیر اور کئی بار مجرمانہ حدوں کو پار کرنے والی غلطیوں کے لیے پی اے سی کے کسی عملے کو سزا دی گئی۔ ہر فرقہ وارانہ فساد کی جانچ رپورٹ لیپا پوتی یا خانہ پری بن کر رہ جاتی تھی۔ دل چسپ بات یہ تھی کہ 1980 میں جب وشوناتھ پرتاپ سنگھ صوبے کے وزیر اعلیٰ تھے، مراد آباد کی عیدگاہ میں سور گھس جانے کی وجہ سے بڑے پیمانے پر دنگے بھڑکے تھے اور اس کے اثر سے صوبے کے ایک درجن سے زیادہ شہر اور قصبے سلگ اٹھے تھے۔ ان فسادات میں بھی پی اے سی پر فرقہ وارانہ تعصب سے کام لینے کے الزام لگے تھے۔ الزامات سے مضطرب وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے پی اے سی کے ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان تبدیلیوں میں سے ایک پی اے سی کی ہر بٹالین میں مناسب تعداد میں اقلیتوں کی نمائندگی کو یقینی بنانا بھی تھا۔ 'وشیش سیوادل' کے نام سے پی اے سی کی کچھ نئی پلٹنیں کھڑی کی گئیں اور یہ سمجھا گیا کہ خصوصی ساز و سامان، اقلیتوں کی موجودگی اور ضروری تربیت سے لیس یہ بٹالینیں فرقہ وارانہ فسادات کے دوران اس طرح کے الزامات کا موقع نہیں دیں گی جو آزادی کے بعد کے لگ بھگ ہر فساد میں ان کے اوپر لگتے رہے ہیں۔ یہ تجربہ

کتنا کامیاب رہا، اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس ٹکڑی نے ہاشم پورہ کانڈ کیا وہ اسی یوجنا کے تحت کھڑی کی گئی اکتالیسویں بٹالین کا حصہ تھی۔

سی ایل واسن نام کے ایک افسر کو ان پلٹنوں کو کھڑا کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ میں واسن کا ماتحت رہ چکا تھا اور بھرتی کے عمل کے دوران ان سے کئی بار اس موضوع پر بات چیت کا مجھے موقع ملا تھا۔ مجھے ہمیشہ یہ جان کر دکھ ہوتا تھا کہ 'وِشیش سیوادل' کے نام سے کھڑی ہونے والی ان پلٹنوں میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی کم وبیش پی اے سی کی دیگر بٹالینوں کے برابر ہی تھی۔ مسلمانوں کی کم بھرتی کے لیے واسن کے پاس بھی وہی سب اسباب تھے جو عام طور سے پولیس میں ان کی قلیل ترین نمائندگی کے لیے دیے جاتے ہیں، مثلاً مسلمان تعلیم پر دھیان نہیں دیتے، وہ پولیس کی بھرتی میں آتے نہیں یا کم عمر میں ہی ان کے بچے موٹر میکینک جیسے کاموں میں لگ جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ بے دلی سے کھڑی کی گئی وشیش سیوادل کی پلٹنیں پی اے سی کی دوسری بٹالینوں کی طرح ہی کام کرتیں رہیں اور آئندہ دور میں اتر پردیش کی سیاسی لیڈر شپ نے وشیش سیوادل کا یہ خصوصی نام بھی ختم کر دیا۔

میں نے کئی لوگوں کے منہ سے یہ سنا ہے کہ آزادی کے فوراً بعد سردار پٹیل کی طرف سے کوئی ایسا سرکلر جاری ہوا تھا جس میں اتر پردیش پی اے سی میں مسلمانوں کو نہ لینے کی صلاح دی گئی تھی۔ مجھے نہیں پتا اس میں کہاں تک سچائی ہے۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن ایسا کوئی سرکلر مجھے نہیں ملا اور نہ ہی کسی ایسے افسر سے میری ملاقات ہوئی جس نے اس سرکلر کو خود پڑھا ہو۔ زیادہ امکان ہے کہ سردار پٹیل نے ایسا کوئی سرکلر جاری ہی نہ کیا ہو۔ پھر بھی، یہ بھی ایک سچ ہے کہ پی اے سی میں مسلمانوں کی تعداد تین چار فی صد سے زیادہ کبھی نہیں رہی۔

میں نے ایک دوبار کمرے میں چل رہی بحث میں مداخلت کر اس حقیقت کی طرف وزیر اعلیٰ کا دھیان کھینچنے کی کوشش کی لیکن ایک تو وہاں موجود لوگوں میں، میں سب سے

جونیئر تھا اور دوسرے اس دلیل میں وہاں موجود لوگوں میں کسی کی دلچسپی نہیں تھی، اس لیے میرے پاس خاموش سامع بن کر رہنے کے سوا کوئی متبادل نہیں تھا۔ لیکن وہاں اس سہ پہر جو کچھ ہو رہا تھا اس نے اندر سے مجھے بے چین ضرور کر دیا۔ وہاں پہلا فیصلہ یہ کیا گیا کہ ہاشم پورہ قتل عام کے سلسلے میں دونوں ایف آئی آر کی تفتیش سی آئی ڈی سے کرائی جائے۔ تفتیش پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے ہمارے پاس تھی اور جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں لاشوں کو نکالنے، ان کا پوسٹ مارٹم کرانے، انھیں دفنانے اور غازی آباد میں شانتی قائم رکھنے کے دباؤ میں ابھی تک میں ادھر دھیان نہیں دے پایا تھا لیکن مجھے پوری امید تھی کہ اگلے کچھ دنوں میں ہم پوری طرح سے تفتیش میں جٹ سکیں گے اور قاتلوں اور ان سے یہ گھناونی واردات کرانے والوں تک پہنچ سکیں گے۔ لیکن اس وقت بحث کرنے کا موقع نہیں تھا۔ اردلی روم سے ہی ایک ریڈیو گرام پولیس ڈائرکٹر جنرل دیا شنکر بھٹناگر کی طرف سے ہوم سکریٹری ماتا پرساد کے لیے بھیجا گیا جس میں وزیر اعلیٰ کا یہ آدیش درج تھا کہ تفتیش غازی آباد پولیس سے لے کر سی آئی ڈی کی کرائم برانچ کو سونپ دی جائے۔ اس کے علاوہ بھی وہاں جو باتیں ہو رہی تھیں وہ بنیادی طور پر ڈیمج کنٹرول کی مہم جیسی ہی تھیں۔

کچھ گھنٹوں بعد جب وزیر اعلیٰ اور ان کے ساتھ آئے افسروں کو لے کر ہیلی کاپٹر اڑ گیا اور میں واپس اپنی رہائش گاہ کے لیے چلا تب پچھلے کئی گھنٹوں کی تھکن اور بے خوابی کا بوجھ تو مجھے جسمانی روپ سے توڑ ہی رہا تھا، ایک خاص طرح کے ذہنی تناؤ نے بھی مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اردلی روم میں جو کچھ ہوا تھا اس سے مجھے کہیں نہ کہیں یہ احساس ہو رہا تھا کہ کسی کی دلچسپی مجرموں کی شناخت کرنے اور انھیں سزا دلانے میں نہیں تھی۔ ویر بہادر سنگھ ایک سیاسی آدمی تھے اور وہ بخوبی جانتے تھے کہ اگر اس معاملے کو دبایا نہیں گیا تو اس کے گمبھیر نتائج ہوں گے۔ ان کے ساتھ کے سرکاری عملے سے بھی یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وزیر اعلیٰ کو کوئی ایسا مشورہ دیں گے جو انھیں ناپسند ہو۔ میں نے آج صبح کے اخباروں کو اس بے چینی سے کھولا تھا کہ ان میں ہاشم پورہ کی واردات شہ سرخیوں

میں ہوگی لیکن غازی آباد میں دو مقامات پر بڑی تعداد میں لاشیں ملنے یا ہاشم پورہ سے کچھ لوگوں کو اٹھائے جانے یا ان کے لاپتا ہونے کا کہیں کوئی ذکر نہیں تھا۔ میرٹھ کو لے کر جس طرح کی رپورٹنگ ہندی اور انگریزی کے اخبار کر رہے تھے اس میں یہ کوئی بہت تعجب خیز نہیں تھا، لیکن پھر بھی مجھے لگتا تھا کہ دہلی کی سرحد پر واقع ہونے والی اس واردات پر راجدھانی سے چھپنے والے اخباروں کی نظر ضرور پڑے گی اور کم سے کم وہ تو اس پر ٹوٹ ہی پڑیں گے۔ لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے اردلی روم میں جو ماحول تھا اس سے مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ طاقتور لوگ اس پر پوری طرح سے پردہ ڈالنے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس کی سنگینی کو کم سے کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

سی آئی ڈی کی کرائم برانچ جسے عام بول چال میں سی بی سی آئی ڈی کہا جاتا ہے، ایک زمانے میں بڑا پیشہ ورادارہ ہوا کرتی تھی اور پیچیدہ معاملوں کی تفتیش اسے سونپی جاتی تھی۔ ایک بار سی بی سی آئی ڈی کو تفتیش ملنے کا مطلب تھا کہ اونچے سے اونچے رسوخ والے مجرموں کا بچنا بھی مشکل ہے۔ عام طور سے سی بی سی آئی ڈی میں تقرر ماہرینِ تفتیش اور قانون کے اچھے جانکار افسروں کا ہی ہوتا تھا۔ لیکن پچھلی کچھ دہائیوں سے سی بی سی آئی ڈی طاقتور لوگوں کو بچانے کی سب سے بڑی ایجنسی کے روپ میں ابھری ہے۔ اکثر ایم ایل اے یا اراکین پارلیمنٹ کی مدد لے کر بارسوخ مجرم اپنے خلاف دائر مقدموں کی تفتیش سی بی سی آئی ڈی کو منتقل کرا لیتے ہیں اور ایک بار ایسے معاملے سی بی سی آئی ڈی کو منتقل ہوتے ہی پولیس کی بھاشا میں 'بستہ خاموشی' میں گم ہو جاتے ہیں۔ پچھلی کچھ دہائیوں میں سی بی سی آئی ڈی ایسے ناکارہ افسروں کا قبرستان بن گئی ہے جنھیں بطور سزا یہاں بھیجا جاتا ہے۔ ایسے میں مجھے فطری طور پر یہ تشویش ہوئی کہ ہاشم پورہ کانڈ کی تفتیش کی کیا دُردَشا ہوگی؟ بعد میں جس طرح سے تفتیش ہوئی اس سے میرا خدشہ درست ثابت ہوا۔ تفتیش کے معیار پر میں آگے چل کر بات کروں گا۔

پولیس لائن سے اپنے گھر جاتے وقت تک میرے دل میں یہی ادھیڑ بن چلتی رہی۔

اگر مجرموں کو سزا دلانی ہے تو سرکاری مشینری کو جھنجوڑ کر فعال کرنا ہوگا۔ گھر پہنچ کر بھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ ایک طرف تو پولیس جیون کی تربیت تھی جس نے چیزوں کو چھپانے اور حسب ضرورت ہی اجاگر کرنے کا سبق سکھایا تھا، اور اسی کے ساتھ اس جوکھم کا احساس بھی تھا جس کے تحت بارسوخ لوگوں کی مرضی کے خلاف کوئی خبر لیک ہونے اور انھیں پتا چلنے پر آپ کو ان کے غیض وغضب کا نوالہ بننا پڑ سکتا ہے۔ دوسری طرف اس جابرانہ قتل عام نے مجھے اندر تک اتنا ہلا دیا تھا کہ میں کسی بھی قیمت پر قاتلوں کو سزا دلانا چاہتا تھا اور اس کے لیے کوئی بھی جوکھم اٹھا سکتا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے میں جسمانی اور ذہنی روپ سے اس بری طرح تھک چکا تھا کہ کسی فیصلے پر فوراً پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ گھر میں واقع اپنے دفتر میں بیٹھ کر میں تھوڑی دیر شہر اور دیہات کے تھانیداروں سے ٹیلیفون اور وائرلیس سیٹ پر حالات کی جانکاری لینے کی کوشش کرتا رہا لیکن نیند نے مجھے اس قدر بے بس کر دیا کہ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب میں اپنی کرسی سے اٹھا اور اندر جا کر بستر پر لڑھک گیا۔ میں پتا نہیں کتنی دیر تک گہری نیند سوتا رہا اور جب جاگا تو بیڈ روم کی کھڑکیوں سے اندھیرا اندر جھانک رہا تھا۔ ہڑبڑا کر میں نے گھڑی دیکھی، ساڑھے سات بج رہے تھے۔ مطلب میں لگ بھگ دو گھنٹے تک بے سدھ سویا تھا۔ گہری نیند نے جسم کو ہلکا کر دیا تھا۔ بستر پر لیٹے لیٹے میں نے پچھلے دو دنوں میں پیش آنے والے واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ 22/23 مئی کی رات مکن پور میں نہر کی پٹری پر لاشوں اور زمین پر پڑے خون کے تھکوں کے بیچ سنبھال سنبھال کر رکھے گئے قدم یاد آئے، باب الدین کی داستان یاد آئی اور یاد آیا وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ کے ساتھ بھور کا سورج اگنے تک میرٹھ سرکٹ ہاؤس کے وی وی آئی پی روم میں ہونے والا سوچ بچار۔ 23 تاریخ کو دن بھر پاگلوں کی طرح شہر میں بھاگتے ہوئے یہ یقینی بنانا کہ لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہو جائے اور انھیں بغیر کسی رکاوٹ کے دفنا دیا جائے، یہ بھی یاد آیا۔ ان سب کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا تھا کہ افواہیں شہر کی فضا نہ بگاڑ پائیں اور غازی آباد میرٹھ کے راستے پر نہ چل پڑے۔ سب سے

اہم یادیں تھیں آج سہ پہر میں غازی آباد پولیس لائن میں ہوا غور وفکر جس میں ان وارداتوں کی تفتیش کو لے کر دوررس فیصلے لیے گئے تھے۔ میں شانتی کے ساتھ بستر پر پڑے پڑے سب کچھ سوچتا رہا اور ٹھنڈے دماغ سے ایک ایسے فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کرتا رہا جس میں جوکھم ضرور تھے لیکن میرا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ اگر میں نے جلد ہی اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تو آزادی کے بعد کے سب سے بڑے حراستی قتل عام کے کلنک پر پردہ پڑا رہے گا اور اس معاملے کے مجرم سزا سے بچ نکلیں گے۔ گہری نیند نے مجھے فیصلے پر پہنچنے میں مدد کی۔ دل میں چل رہا تذبذب ختم ہو چکا تھا اور فیصلہ ہو چکا تھا۔ میں جھٹکے سے اٹھا۔ اگر اس پورے معاملے کو منطقی نتیجے تک پہنچانا ہے تو میڈیا کو اس پورے معاملے میں شامل کرنا ہوگا!

سرکاری نوکری، خاص طور سے پولیس میں داخل ہوتے ہی جو چیز سب سے پہلے سکھائی جاتی ہے اور جو بعد میں دھیرے دھیرے آپ کی شخصیت کا حصہ بن جاتی ہے، وہ رازداری کو لے کر آپ کی ایک خاص طرح کی سمجھ ہوتی ہے۔ آفیشل سیکریٹس ایکٹ یا اس طرح کے تمام دوسرے قانونوں کے مکڑ جال میں لپٹی رازداری کا تصور کافی حد تک غیر مرئی ہوتا ہے۔ مجھے آج تک کوئی ایسی مثال یاد نہیں جس میں، دوسرے ملکوں کے لیے جاسوسی کرنے کے معاملوں کو چھوڑ کر، کسی شخص کو رازداری کا اصول توڑنے کے قانون کے تحت سزا ملی ہو۔ پھر بھی ایک نادیدہ خوف کی تلوار ہمارے سروں پر لٹکتی رہتی ہے۔ عام طور سے سرکاری کرمچاری صحافیوں یا دوسروں کے سامنے سچ بولنے سے جھجکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نوکر شاہی کو بہت کم اعتبار حاصل ہے۔ خاص طور سے قدرتی آفات، سانحوں یا فسادات میں جان مال کے نقصان کے اس کے آنکڑوں پر شاید ہی کوئی یقین کرتا ہو۔ ہاشم پورہ کے معاملے میں کچھ کچھ ایسا ہی ہوا۔ میں گھنٹوں اسی تذبذب میں رہا کہ مجھے اپنا منہ کھولنا بھی چاہیے یا نہیں۔ آج مجھے قبول کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ

میں ڈرا ہوا بھی تھا۔ کسی بھی دوسرے نوکرشاہ کی طرح میرے دل میں بھی ڈر تھا کہ یہ حقائق اجاگر ہونے پر کہ اس گھناؤنے قتل عام کی جانکاری میں نے پریس کو لیک کی ہے، میرے اپنے محکمے میں سب میرے دشمن بن سکتے تھے اور سب سے بڑھ کر وزیراعلیٰ ویربہادر سنگھ یہ جانتے ہی میرا کرئیر برباد کردیتے۔ لیکن جو کچھ ہوا تھا وہ اتنا بھیانک تھا کہ میرے لیے چپ رہنا بھی ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ کافی دیر تک خود سے سنگھرش کرنے کے بعد میں نے طے کیا کہ مجھے کچھ نہ کچھ ایسا کرنا ہے کہ معاملہ بستۂ خاموشی میں دفن نہ ہونے پائے۔

میں واپس اپنے دفتر میں آبیٹھا اور ٹیلیفون کا بزر دے کر اردلی سے ارُن وَردھن کو ٹیلیفون ملانے کے لیے کہا۔ مجھے پتا تھا کہ 'نوبھارت ٹائمز' کا ادارتی دفتر اس وقت سرگرمیوں سے بھرا ہوگا۔ ارُن وَردھن کے روٹین کو جتنا میں جانتا تھا اس کے مطابق انھیں اس وقت اپنی ڈیسک پر کسی نہ کسی اسٹوری پر کام کرتے ہونا چاہیے تھا۔ میرا اندازہ صحیح نکلا اور ٹیلیفون کا بزر بج اٹھا۔ دوسری طرف ارُن وردھن ہی تھے۔ اپنی آواز کے ہیجان کو دباتے ہوئے میں صرف اتنا کہہ پایا کہ وہ فوراً میرے پاس آجائیں۔ میں انھیں ایک ایسی خبر دینے جارہا تھا جو ان کے کیریر میں نہ جانے کیا کیا جوڑ سکتی تھی۔ ارُن وردھن نے کچھ سر پیر جاننے کی کوشش کی لیکن میں نے سختی سے انھیں واضح کردیا کہ ٹیلیفون پر کچھ بھی بتانا ممکن نہیں ہے اور اگر وہ آج ہی رات میرے پاس نہیں پہنچے تو ایسا کچھ کھو دیں گے جس کے لیے زندگی بھر پچھتائیں گے۔ اگر انھیں اس خبر میں دلچسپی نہیں ہے تو میں کسی اور سے رابطہ کرلوں گا۔ اس کے بعد کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا کہ ارُن وردھن ضرور آئیں گے۔

ارُن وردھن کو میں ان کے الہٰ آباد کے دنوں سے جانتا تھا۔ ہندی کے اہم کہانی کار امرکانت کے بیٹے ارُن وردھن ایک بے چین آتما کی طرح تھے۔ جلدی آپا کھو دینے والے اور اپنے دفتر کے ساتھیوں کے ساتھ اسہج تعلقات کے سبب انھیں اکثر اپنے سینئرز

کے سامنے خود کو ثابت کرنا ہوتا تھا۔ ثابت کرنے کے اس عمل کا ایک طریقہ کچھ ایسی خبر لانا تھا جنھیں اخباری بھاشا میں 'ایکسکلوسِو اسٹوری' کہا جاتا ہے اور انھیں حاصل کرنے والوں کے نام سے اخبار چھاپتے ہیں۔ میں نے ارُن وردھن کو پچھمی اتر پردیش کے ایک بڑے مافیا کے بارے میں کچھ خبریں دی تھیں اور اس پر مبنی اسٹوری سے ان کا گراف اپنے دفتر میں یکا یک کافی اوپر چلا گیا تھا۔ وہ اکثر فون کر کے مجھ سے اس طرح کی دوسری خبروں کا اصرار کرتے رہتے تھے۔ آج جس طرح میں نے ان کے دل میں کھلبلی پیدا کر دی تھی اس سے مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اگلے کچھ گھنٹوں میں میرے پاس ہوں گے اور یہی ہوا بھی۔

دس بجتے بجتے ارُن وردھن پولیس سپرنٹنڈنٹ نواس پہنچ گئے۔ میں انھی کا انتظار کر رہا تھا۔ پتا چلا کہ نو بجے اپنا کام ختم کر وہ دفتر سے سیدھے اپنے پرانے لیمبریٹا اسکوٹر کو تیز رفتار سے دوڑاتے ہوئے پہنچے تھے۔ دھماکے دار اسکوپ حاصل کرنے کے امکان سے پیدا شدہ ہیجان ان کے چہرے پر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے میں نے جو کچھ بتایا اس سے ارُن وردھن کے چہرے کی رنگت بدلتی گئی۔ پلیٹ میں بے دلی سے گھومتی ان کی انگلیاں یہ ظاہر کر رہی تھی کہ اس وقت انھیں کھانا کھانے سے کہیں زیادہ دلچسپی اسکوپ حاصل کرنے میں ہے۔ ہم نے جلدی جلدی کھانا ختم کیا اور آفس میں بیٹھ گئے۔ اس کے بعد ایک طویل رات کے پانچ چھ گھنٹے اس گاتھا کو ٹکڑے ٹکڑے جوڑنے اور انھیں چھوٹے بڑے صفحوں پر لکھنے، پھاڑنے اور پھر سے لکھنے میں گزرے۔ یہ گاتھا صرف میرے لیے ہی ناقابلِ یقین حد تک المیہ نہیں تھی بلکہ ارُن وردھن کو بھی یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ دہلی کے قریب ایسا کچھ ہو سکتا ہے۔ اگر یہ داستان انھوں نے میرے منھ سے نہ سنی ہوتی تو شاید وہ اسے ذہنی اپج ہی سمجھتے۔ اس ڈرافٹ میں بہت سی چیزیں جوڑی گھٹائی گئیں۔ آخر میں 1500-1400 الفاظ کی جو رپورٹ بنی اس سے میں مطمئن تھا اور ارُن وردھن جذبۂ جوش سے معمور۔

تین بجے بھور تک جب ہماری رپورٹ تیار ہوئی ہم دونوں کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں اور ہمارے لیے اور زیادہ جاگتے رہنا لگ بھگ ناممکن ہوتا جارہا تھا۔ میں نے اڑن وردھن کو گیسٹ روم میں پہنچادیا اور خود اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ صبح جب آٹھ بجے کے قریب میں اٹھا اور گیسٹ روم میں گیا تب تک اڑن جا چکے تھے۔ باہر نکل کر سنتری سے پوچھنے پر پتا چلا کہ وہ تو صبح پانچ بجے کے آس پاس ہی چلے گئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اسکوپ حاصل کرنے کی بے چینی نے انھیں ٹھیک سے سونے نہیں دیا تھا۔ پوری رات جاگے ہوئے آدمی کا اسکوٹر چلا کر غازی آباد کی سڑکیں پار کرتے ہوئے دہلی شہر کے پچھمی علاقے میں اپنے گھر راجوری گارڈن جانے کی خبر خدشات کو جنم دیتی تھی اور اسی سے فکرمند ہو کر میں نے ٹیلیفون آپریٹر سے اڑن کے گھر فون ملانے کے لیے کہا۔ میری جان میں جان آئی جب ادھر سے ان کی پتنی نے یہ اطلاع دی کہ وہ چھ بجے کے قریب گھر پہنچ گئے تھے اور اب بے سدھ سو رہے ہیں۔

تیسرے پہر اڑن کا فون آیا۔ انھوں نے اپنے ایڈیٹر راجندر ماتھر کو رپورٹ دکھائی تھی اور ایڈیٹر نے رپورٹ کی خوب تعریف کی تھی۔ اڑن کی آواز سے خوشی جھلک رہی تھی اور ہم نے ٹیلیفون پر مذاق میں صحافت کے ان قومی اور بین الاقوامی اعزازات پر گفتگو کی جو انھیں اس رپورٹ کے چھپنے کے بعد حاصل ہو سکتے تھے۔ مجھے بھی اندر سے گہرے اطمینان کا احساس ہوا کہ میں نے ایک ایسا کام کر دیا ہے جس سے اب کسی کے لیے اس واردات کو دبا پانا ممکن نہیں ہو سکے گا۔ اس کے بعد میں دیر رات تک شہر میں ہاشم پورہ کے بعد کے ردعمل کے سلسلے میں بندوبست میں الجھا رہا۔ رات بارہ بجے کے قریب گھر لوٹا تو باہر ہی سنتری نے بتایا کہ اڑن کا فون آیا تھا۔ میں نے فوراً ان سے بات کرانے کے لیے کہا۔ تھوڑی دیر میں ٹیلیفون کا بزر بجنے پر جب میں نے فون اٹھایا تب ادھر سے اڑن کی آواز سنائی دی۔ ایک بار پھر جوش و ہیجان سے بھری ہوئی۔ کل ان کی خبر 'نوبھارت ٹائمز' کے پہلے صفحے پر آرہی تھی اور وہ راتوں رات اسٹار بننے جا رہے تھے۔ میں نے پھر مذاق

میں دو تین بڑے انعامات کا حوالہ دیا جو بین الاقوامی سطح پر ملتے تھے اور اس خبر پر انھیں ملنے والے تھے۔ ہم دونوں نے ہنستے ہوئے اپنی بات ختم کی اور میں سونے چلا گیا۔ سویرے اٹھتے ہی روز کی طرح میں نے اپنا دن اخباروں سے شروع کیا۔ بستر کے پہلو میں رکھے اسٹول پر ایک درجن سے زیادہ اخبار پڑے تھے، میں نے ہاتھ بڑھا کر ڈھیر میں سے 'نو بھارت ٹائمز' نکالا۔ بیتابانہ جوش سے میں نے پہلا صفحہ کھنگالا۔ پہلے باٹم اسپریڈ دیکھا جہاں پر اس خبر کے ہونے کا سب سے زیادہ امکان تھا، وہاں سے گزرتی ہوئی میری نگاہیں نہ صرف صفحے کے چپے چپے پر پھسلیں بلکہ انھوں نے اخبار کا ایک ایک کالم چھان ڈالا۔ کہیں بھی ہاشم پورہ کا ذکر نہیں تھا، مجھے مایوسی ہوئی۔ میں نے ٹیلیفون کا بزر بجایا اور ارُن وردھن کو فون لگانے کے لیے کہا۔ ان کی آواز میں مایوسی سے زیادہ تعجب جھلک رہا تھا۔ میرا فون آنے کے پہلے وہ اپنے ایڈیٹر سے بات کرنے کی ناکام کوشش کر چکے تھے۔ انھوں نے مجھے تسلی دی کہ وہ مدیر سے بات کر مجھے اسٹوری نہ چھپنے کا سبب بتائیں گے۔ انھیں خدشہ تھا کہ جگہ کی کمی کے سبب اس دن خبر نہیں چھپ پائی ہے لیکن انھیں پوری امید تھی کہ دوسرے دن ضرور چھپے گی۔ بہر حال سب کچھ مدیر کے ہاتھ میں تھا اور مدیر سے بات کر کے ہی قطعی طور پر کچھ کہا جا سکے گا۔

شام چار بجے ارُن وردھن کا فون آیا۔ ان کی اپنے مدیر راجندر ماتھر سے بات ہو گئی تھی اور انھیں بتایا گیا تھا کہ مدیر نے ان کی رپٹ کسی دوسرے سینئر ساتھی کو جانچنے اور چھپنے کے بعد اس کے پڑنے والے اثرات کا اندازہ لگانے کے لیے دے دی تھی۔ ارُن کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ یہ ایک رسمی کارروائی تھی اور اخبار میں اس خبر کے نہ چھپنے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا۔ دوسرے دن بھی میں نے اٹھ کر سب سے پہلے 'نو بھارت ٹائمز' تلاش کیا اور مجھے پہلے کی طرح ہی مایوسی ہوئی۔ یہ نراشا اس لیے اور بڑھ گئی تھی کیونکہ میں سوچتا تھا کہ اتنی بڑی واردات پر میرے بتائے بغیر بھی دہلی کے اخباروں کی نظر پڑے گی اور کوئی نہ کوئی اخبار اسے اٹھائے گا ضرور۔ لیکن کسی بھی اخبار میں غازی آباد کی نہروں

میں لاشیں ملنے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ٹیلیفون کا بزر بجا۔ دوسری طرف ارُن وردھن تھے۔ اس بار ان کی آواز میں مایوسی سے زیادہ فکرمندی تھی۔ کہیں کوئی دفتر کی سیاست تو کام نہیں کر رہی؟ جب سے ان کی پچھمی اتر پردیش کے مافیا والی خبر چھپی تھی، دفتر میں بہت سے رفقائے کار ان سے حسد کرنے لگے تھے۔ انھیں خدشہ تھا کہ انھی لوگوں نے کوشش کر کے یہ خبر چھپنے سے رکوائی ہوگی۔ بہرحال وہ آج دوپہر میں مدیر سے صاف صاف پوچھیں گے کہ ان کی اسٹوری چھپے گی یا نہیں۔ میں نے ہلکی سی دھمکی بھی دی کہ اگر کل بھی ان کے اخبار میں اس قتل عام کی خبر نہیں چھپی تو میں کسی اور اخبار میں چھپوادوں گا۔ اگلے دن بھی وہی ہوا۔ میں نے تجسس کے ساتھ 'نو بھارت ٹائمز' دیکھا، وہاں کچھ نہیں تھا، دوسرے اخباروں کو کھنگالا، ہاشم پورہ پر کہیں کچھ نہیں تھا۔ مجھے اندر سے بے چینی محسوس ہونے لگی تھی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور ہاشم پورہ کو لے کر میڈیا ایک خاص طرح کی مجرمانہ خاموشی اپنائے ہوئے تھا۔

شاید 1987 کا بھارتیہ سماج اس کے لیے ذمہ دار رہا ہو۔ آج 24 سال بعد جب میں ان دنوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو کئی بار مجھے یاد آتا ہے کہ رام جنم بھومی بابری مسجد آندولن کے سبب بھارتیہ سماج کا بری طرح سے فرقہ وارانہ پولرائزیشن ہو گیا تھا۔ شاید تقسیم کے بعد کا سب سے خراب دور تھا یہ۔ خاص طور سے ہندو مڈل کلاس تیزی سے فرقہ وارانہ پروپیگنڈے کا شکار ہو رہا تھا۔ سماج کا کوئی بھی طبقہ چاہے وہ پولیس یا انتظامیہ میں ہو، صحافت سے وابستہ ہو، یا کھاتا پیتا عام متوسط طبقہ، سبھی جانے انجانے اس زہر کے شکار ہو رہے تھے جو لگ بھگ ایک دہائی سے چل رہے رام جنم بھومی آندولن کی اپج تھا۔ وشو ہندو پریشد نے دس برسوں کی انتھک محنت سے گاؤں گاؤں میں شِلا پوجن جیسے کاریہ کرموں کے ذریعے فرقہ وارانہ تقسیم کو ایک ایسی حد پر پہنچا دیا تھا جہاں وہ آزادی ملنے کے موقعے پر بھی نہیں پہنچ سکی تھی۔ جن شہروں، قصبوں میں 1947 میں بھی دنگے

نہیں ہوے تھے ان میں بھی مندر کی تعمیر کے لیے نکلی رتھ یاتراؤں کے دوران دنگے ہوے۔ یہ وہ دور تھا جب الہٰ آباد جیسے شہر میں وکیل 'گاندھی مردہ باد!' اور 'گوڈسے زندہ باد!' کے نعرے لگا رہے تھے۔ گھروں، بسوں، ٹرینوں، بازاروں، دفتروں میں ہر جگہ آپ کو پر جوش آوازوں میں بحث ومباحثہ کرتے لوگ مل جاتے۔ پورا دیش سنسنی اور ہیجان سے بھرا ہوا تھا اور ہندو اکثر یہ سوال پوچھتے نظر آتے کہ اگر بھارت میں رام کا مندر نہیں بنے گا تو کیا سعودی عرب میں بنے گا یا پاکستان میں بنے گا؟ یہ ایک ایسی جذباتی دلیل تھی جس کا زمینی حقائق سے کوئی لینا دینا نہیں تھا لیکن اوسط ہندو ذہن کو یہ بڑی آسانی سے اور بہت گہرائی تک چھوتی تھی۔

ہندوؤں کی بڑی تعداد تھی جو کسی نہ کسی روپ میں اس تحریک سے جڑی تھی ان میں سے کچھ آندولن میں براہِ راست شریک تھے اور بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو خود تو آندولن میں سڑکوں پر نکل کر لاٹھی گولی کا سامنا نہیں کر سکتے تھے لیکن اپنے دفتروں میں بیٹھ کر وشو ہندو پریشد یا آندولن کی حمایت میں ماحول بنانے کا کام کر رہے تھے۔ ایسے لوگوں میں اخباروں میں کام کرنے والے صحافی بھی تھے جن میں بہت سے تو بعض اوقات وشو ہندو پریشد کے سویم سیوکوں، یعنی رضا کاروں جیسے رویہ اختیار کیے رہتے تھے۔ ہندی اخباروں میں چند ہی مستثنیٰ تھے جو غیر جانب دارانہ رپورٹنگ کر رہے تھے، زیادہ تر رجحان میں ہندو ہو گئے تھے۔

جیسے جیسے آندولن زور پکڑتا گیا، اس جانب داری کی مثالیں دلچسپ ہوتی گئیں۔ مثلاً ہاشم پورہ کے ڈھائی سال بعد جب اکتوبر رنومبر 1990 میں ایودھیا میں وشو ہندو پریشد نے پہلی پر تشدد چڑھائی کی تھی، پولیس فائرنگ میں 20-15 لوگ مرے تھے لیکن اس دن کے شام کے اور دوسرے دن صبح کے ہندی اخباروں کے مطابق مرنے والوں کی تعداد ہزاروں میں تھی، ایودھیا میں کار سیوکوں کے خون سے سرجو ندی لال ہو گئی تھی، یا پولیس نے اپنے ٹرکوں میں مرنے والوں کے جوتے چپل بھر بھر کر ندی میں بہائے تھے۔

رپورٹنگ کے اس طریقے کی شکایت پر پریس کاؤنسل آف انڈیا نے ہندی شاعر رگھوبیر سہائے کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی تھی جس کے سامنے بنارس کی سنوائی کے دوران میری بھی پیشی ہوئی تھی اور میں نے ان کا دھیان وہاں سے چھپنے والے ایک اہم ہندی روزنامے میں چھپی خبر کی طرف دلایا تھا۔ اس خبر کے مطابق بنارس سبزی منڈی کی ایک بڑھیا کی دوکان پر ان دنوں بکنے والے بینگنوں کو گاہک جب گھر لے جا کر کاٹتا تھا تو اس کے کٹے ٹکڑوں پر جے شری رام لکھا ملتا تھا۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں بھری پڑی تھیں جن سے آپ پریس کی جانب داری کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

میں نے پہلے ایک پریس کانفرنس کا ذکر کیا ہے جسے میرٹھ کے اس وقت کے ضلع مجسٹریٹ رادھے شیام کوشک نے مخاطب کیا تھا اور جس میں ان کے ساتھ میرٹھ کے نو مقررہ سینئر پولیس سپرنٹنڈنٹ گردھاری لال شرما اپنے سے پہلے والے افسر وی کے بی نائر کے ساتھ موجود تھے۔ یہ پریس کانفرنس اس پریس کانفرنس کے جواب میں ہو رہی تھی جسے ذوالفقار ناصر کو لے کر سید شہاب الدین نے چندر شیکھر اور سبرامنیم سوامی جیسے سینئر نیتاؤں کی موجودگی میں، واردات کے آٹھ دن بعد، یکم جون کو منعقد کی تھی۔ اس کانفرنس میں ذوالفقار ناصر نے خود کو دوسرے بہت سارے لوگوں کے ساتھ ہاشم پورہ سے پی اے سی کے ذریعے اٹھائے جانے اور گنگ نہر پر لا کر گولی مارنے کی واردات کا بیان تفصیل کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے کپڑے اتار کر اپنے زخم بھی صحافیوں کو دکھائے تھے۔ اگر ایسی واردات کسی دوسرے مہذب معاشرے میں ہوئی ہوتی تو اس پریس کانفرنس کے بعد کتنے سر لڑھکے ہوتے! لیکن ہمارے یہاں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ سب سے پہلے تو اخباروں نے اس پر بہت کم توجہ دی، زیادہ تر نے اسے اندر کونوں کھدروں میں چھاپا اور سرکاری حلقوں نے فوراً اس طرح کی کسی واردات سے ہی انکار کرنے کا راگ الاپنا شروع کر دیا۔ اپنی پریس کانفرنس میں رادھے شیام کوشک نے ذوالفقار ناصر کو جھوٹا قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس نام کا کوئی آدمی ہاشم پورہ محلے میں رہتا ہی نہیں۔

کوشک اور نائر دونوں 22-23 کی رات میرٹھ سرکٹ ہاؤس میں وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ کے کمرے میں موجود تھے جب میں نے اور نسیم زیدی نے ہاشم پورہ سے وابستہ اور چند گھنٹے پہلے پیش آیا واقعہ بیان کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہاشم پورہ کے کافی لوگ، جنھیں حراست میں لیا گیا تھا، مار دیے گئے ہیں، لیکن صحافیوں کو انھوں نے بڑے آرام سے بتایا کہ ہاشم پورہ سے جن لوگوں کو پکڑا گیا تھا وہ سبھی جیلوں میں بند ہیں۔ ان کے مطابق ہاشم پورہ میں کسی نے بھی اپنے اہل خانہ کے غائب ہونے کی رپورٹ نہیں لکھوائی ہے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ کرفیو کے باوجود لوگوں کے مارے جانے کی افواہیں میرٹھ میں گشت کر رہی تھیں اور ہاشم پورہ کے لوگ تھانوں چوکیوں کے چکر لگا کر اپنے لوگوں کے بارے میں جانکاریاں حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ کیا یہ صرف اپنی نالائقی چھپانے کی کوشش تھی یا اس کے پیچھے چھپا وہ فرقہ پرستی کا جذبہ تھا جو ہم میں سے بیشتر اپنے اندر چھپائے رہتے ہیں اور موقع پاتے ہی جو باہر نکل آتا ہے۔ بہت سے فرقہ وارانہ فسادات سے مجھے نپٹنے کا مجھے موقع ملا ہے اور میں نے دلچسپی سے اس بھاشا کا مطالعہ کیا ہے، جس کے تحت وہاں تعینات پولیس افسران اور مجسٹریٹ ہندوؤں کے لیے 'ہم' اور مسلمانوں کے لیے 'وہ' لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ ہاشم پورہ کو لے کر میرٹھ کی انتظامیہ اور پولیس کا رویہ بہت کچھ اسی تعصب کا نتیجہ تھا۔ اس پر آگے میں نے تفصیل سے لکھا ہے۔

رام جنم بھومی آندولن کے دوران تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات آزادی کے بعد سب سے خراب دور سے گزر رہے تھے۔ صرف ایک مثال سے میں اس سیاق کو ختم کروں گا۔ میرٹھ کے انھی دنگوں کے دوران گرفتار ہونے والے بعض لوگوں کو فرخ آباد سینٹرل جیل بھیجا گیا تھا۔ ان میں سے ایک جتھا جب وہاں پہنچا تو اس پر جیل کے اندر حملہ کیا گیا اور اس حملے میں جیل میں پہلے سے بند قیدیوں کے علاوہ جیل کے عملے نے بھی حصہ لیا۔ اس واردات میں چھ مسلمان مرے اور کافی زخمی ہوئے تھے۔

ایسے مشکل دور میں بہت کم لوگ تھے جو اپنی فہم وفراست بچا سکے تھے اور یہ بات صرف صحافت پر ہی لاگو نہیں ہوتی، اکادمک دنیا، عدلیہ، نوکر شاہی، کارپوریٹ سیکٹر، غرض یہ کہ کوئی شعبہ اس آندھی سے اچھوتا نہیں بچا تھا۔ تو کیا راجندر ماتھر بھی اسی بھیڑ کا حصہ بن گئے تھے؟ میں آج تک اس سوال کا جواب نہیں ڈھونڈ پایا ہوں۔ میں خود ذاتی طور پر انھیں نہیں جانتا تھا اور دو ایک بار الگ الگ پروگراموں میں ہلکی پھلکی ملاقاتوں سے زیادہ کچھ بھی انھیں لے کر میرے حافظے میں نہیں ہے۔ میں نے انھیں جاننے والے اور ان کے ساتھ کام کرنے والے کئی لوگوں سے باتیں کی ہیں اور مجھے ایک بھی آدمی ایسا نہیں ملا جس نے انھیں فرقہ پرست بتایا ہو، پھر کیوں اتنی بڑی اور گھناونی واردات کو وہ پچا گئے اور کیوں ان کی ادارت میں دیش کے سب سے بڑے اخبار نے سب سے پہلے خبر ملنے پر بھی اس واقعے پر کچھ بھی لکھنا مناسب نہیں سمجھا؟ ان کی موت کے بعد اخباروں میں چھپے ان کے مضامین اور اداریوں کو کتابی شکل میں چھاپا گیا ہے۔ میں نے دھیان سے ان کے ایک ایک مضمون کو پڑھا لیکن مجھے کئی سو صفحوں میں پھیلی اور حیرت انگیز تنوع رکھنے والی ان کی تحریر میں کہیں کوئی ایسا سراغ نہیں ملا جس میں مذہبی کٹرپن کے تئیں ان کا رجحان جھلکتا ہو۔ بہر حال یہ حقیقت تو اپنی جگہ بنی ہی رہے گی کہ راجندر ماتھر کی ادارت میں چھپنے والے اور تب دیش کے سب سے اہم ہندی روزنامے میں آزادی کے بعد کے سب سے بڑے حراستی قتل عام کی خبر نہیں چھپی اور میرے دل کا تجسس آج تک بلا جواب ہی ہے کہ کہیں راجندر ماتھر بھی اس دور میں اٹھنے والی فرقہ پرستی کی تیز لہروں میں بہہ تو نہیں گئے تھے؟

میں ارُن وردھن کے فون کا انتظار کرتا رہا لیکن نہ ان کا فون آیا اور نہ ہی میں نے انھیں فون کیا۔ پچھلے کچھ دنوں کی طرح ایک بار پھر اس دن بھی دوپہر بعد ارُن کا فون آیا۔ پرانی بے بسی، جھنجلاہٹ اور مایوسی ان کی آواز میں جھلک رہی تھی۔ ایڈیٹر راجندر ماتھر نے ان سے اس معاملے میں درج ایف آئی آر کی کاپیاں مانگی تھیں۔ ساتھ ہی بات

چیت میں کہیں یہ بھی اشارہ دیا تھا کہ اس طرح کی خبریں چھاپنے سے پی اے سی جیسے اداروں کا حوصلہ ٹوٹے گا اور پہلے سے تقسیم شدہ سماج اور زیادہ بٹ جائے گا۔ وہ آخری کوشش کرنے کے پہلے چاہتے تھے کہ میں انھیں ایف آئی آر کی کاپی مہیا کرادوں۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ ویر بہادر سنگھ کے لوگ پولیس سمیت ہر جگہ موجود تھے اور جیسے ہی بہت مستند قسم کی رپٹ چھپے گی شک کی سوئی کسی اندر کے آدمی کی طرف ہی گھومے گی۔ آج یہ لکھنے میں مجھے کوئی جھجک نہیں ہو رہی ہے کہ میں اندر سے ڈرا ہوا بھی تھا۔ میری مڈل کلاس ضمیر بہت بڑا جوکھم لینے سے مجھے روک رہا تھا۔ ایک طرف تو میں چاہتا تھا کہ آزادی کے بعد کے اس حراستی قتل عام کی خبر دنیا کو ملے اور قاتلوں کو سزا دی جائے اور دوسری طرف یہ بھی چاہتا تھا وزیر اعلیٰ یا کسی سینئر افسر کو میرے رول کا پتا بھی نہ چلے۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے ایک اخباری دوست نے ہی کچھ مہینوں بعد ویر بہادر سنگھ تک یہ بات پہنچادی اور مجھے ان کے غیض وغضب کا نشانہ بننا پڑا، لیکن اس کا ذکر بہت مناسب نہیں ہے۔

میں نے ایک بار پھر دھمکی دی کہ اگر 'نو بھارت ٹائمز' میں اگلی صبح یہ خبر نہیں چھپی تب میں کسی دوسرے اخبار میں بیٹھے اپنے دوست کو اسے لیک کر دوں گا۔ ارُن وردھن بڑی عاجزی سے مجھ سے یہ وعدہ کرانے کی کوشش کرتے رہے کہ میں اس خبر کو کسی اور کو نہیں دوں کیونکہ یہ ان کے کریئر کا سب سے بڑا بریک ہونے جارہا تھا۔ میں نے اگلے دن کی وقت کی پابندی لگاتے ہوئے انھیں یہ یقین دلا بھی دیا کہ اگر کل صبح 'نو بھارت ٹائمز' میں ہاشم پورہ کی خبر نہیں چھپی تو میں کسی دوسرے اخبار میں اسے پلانٹ کرنے کے لیے آزاد ہوں گا۔ تین دن سے زیادہ گزر چکے تھے اور اب اس سے زیادہ نہیں رکا جاسکتا تھا۔

ان دنوں میرٹھ سے، بڑی تعداد میں پڑھے جانے والے دو ہندی روزنامے 'امر اُجالا' اور 'دینک جاگرن' چھپتے تھے۔ میں روز صبح بڑے تجسس سے انھیں چھانتا اور روز ہی مایوس ہوتا۔ ان دونوں کی رپورٹنگ متعصبانہ اور ایک طرفہ ہوتی تھی۔ 'امر اجالا' میں 26

مئی 1987 کے ایڈیشن میں میرٹھ کے دنگوں سے متعلق کئی کالم کی ایک تفصیلی رپورٹ چھپی جس میں ایک پیراگراف ہنڈن ندی میں ملی 34 لاشوں کے بارے میں تھا۔ خبر کے مطابق ''غازی آباد کے قریب ہنڈن ندی سے آج چونتیس لاشیں برآمد کی گئی ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ لاشیں میرٹھ دنگوں کے شکار لوگوں کی ہیں۔ ان سبھی لاشوں پر دھاردار ہتھیار کے گھاؤ ہیں۔'' اس چھوٹی سی خبر میں کہیں بھی حراستی قتل، پی اے سی یا ہاشم پورہ کا ذکر نہیں ہے، جبکہ تب تک غازی آباد میں اس طرح کا ذکر ہونے لگا تھا۔ خبر میں گمراہی پھیلانے کے لیے 'دھاردار ہتھیار کے گھاؤ' لکھا گیا ہے جبکہ مرنے والوں کے پوسٹ مارٹم تب تک ہو چکے تھے اور ان کے جسموں پر لگی گولیوں کا ذکر ہو چکا تھا۔ 27 مئی کو اسی اخبار نے ایک چھوٹی سی رپورٹ ''پی اے سی نے تین زندہ لوگوں کو بھی بہا دیا'' عنوان سے چھاپی جس میں تھانہ مرادنگر کو زندہ ملے تین آدمیوں کے بارے میں ایک گمراہ کن اور ادھوری رپورٹ چھاپی گئی تھی۔

دینک جاگرن' نے ضرور 26 مئی 1987 کی اشاعت میں لیڈ لگائی ''گنگ ناہر سے 34 لاشیں ملیں...'' لیکن کئی کالم میں پھیلی اس خبر کو پڑھنے سے یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ ملنے والوں کی لاشیں حراستی قتل عام سے تعلق رکھتی تھیں۔ 28 مئی کو 'امر اجالا' میں چھپی ایک خبر کے مطابق تھانہ ''لنک روڈ کے مکن پور گاؤں کے جنگل میں پولیس نے کچھ لاشیں برآمد کی تھیں۔'' ...اسی جگہ سے دو اور آدمی بھی ملے جو ''مکن پور کے جنگل میں کیسے پہنچے اور وہاں لاشیں کس طرح پہنچی، راز بنا ہوا ہے۔'' ظاہر ہے کہ یہ خبریں پوری طرح بے بنیاد تھیں اور مکن پور کی نہر میں ملی لاشوں اور مرادنگر کی گنگ نہر سے نکلے زندوں کے بارے میں گمراہی پیدا کر رہی تھیں۔ اس طرح اب دنیا کو بتانے کے لیے وہی راستہ بچا تھا جس پر میں چل رہا تھا لیکن بدقسمتی سے اس میں بھی کامیابی ملتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

اگلے دن صبح ایک بار پھر وہی کہانی دہرائی گئی۔ میں نے نو بھارت ٹائمز کا صفحہ صفحہ چھان مارا۔ میرٹھ دنگوں کو لے کر لگ بھگ آدھے صفحوں پر مواد پھیلا ہوا تھا لیکن ہاشم پورہ

کا کہیں ذکر تک نہیں تھا۔ میں نے طے کر لیا کہ اب میں ارُن وردھن سے بات نہیں کروں گا اور کسی دوسری جگہ یہ خبر چھپے گی۔ دوپہر میں ایک بار پھر ارُن کا فون آیا۔ ان کی آواز میں چھپی تھکن اور شدید مایوسی بڑی صاف جھلک رہی تھی۔ ایک بار پھر وہی اصرار کہ میں ایک دن اور رک جاؤں اور وہ آج آخری کوشش کر کے دیکھیں گے۔ میں نے ہاں کہہ تو دیا لیکن میں خود نہیں جانتا تھا کہ میں اب اور رک پاؤں گا یا نہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے کو روکا اور ایک رات اور بیت گئی۔ دوسرے دن صبح میں نے بے دلی سے 'نوبھارت ٹائمز' ٹٹولا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ آج بھی کچھ نہیں چھپا ہوگا کیونکہ اگر ہاشم پورہ کے بارے میں کچھ چھپا ہوتا تو اب تک ارُن وردھن کا فون آچکا ہوتا۔ اخبار میں کچھ نہ پا کر مجھے نراشا نہیں ہوئی اور میں نے اپنی اس یوجنا کو عملی روپ دینا شروع کر دیا جس پر میں پچھلے دو دنوں سے کام کر رہا تھا۔

ان دنوں دیش کے لگ بھگ سبھی بڑے روزناموں کے دفتروں میں میرے دوست تھے اور ان میں سے کوئی بھی اس خبر کو پکڑنے کے لیے لپکتا لیکن میں نے جس اخبار کو چنا تھا وہ ایک ہفت روزہ اخبار تھا اور حالانکہ اس کی اشاعت کی تعداد کم ضرور تھی لیکن اس میں تیز طرار اور باصلاحیت نوجوان اچھی خاصی تعداد میں کام کر رہے تھے اور ان میں سے کئی آج اپنے اخباروں اور چینلوں میں چوٹی پر بیٹھے ہیں۔ سنتوش بھارتی، رام کرپال سنگھ، قمر وحید نقوی، دھیریندر استھانا، ویریندر سینگر، اجے، ارچنا جھا، چنچل سب ایک سے ایک کمٹمنٹ سے بھرے لکھاڑ۔ لکشمی نگر میں 'چوتھی دنیا' کا دفتر دہلی آتے جاتے میرا ایک مستقل پڑاؤ بن چکا تھا۔ ان لوگوں سے میری ملاقات کارٹونسٹ/مصور/افسانہ نگار اور ان سب سے بڑھ کر دوست باز اور بیٹھک باز چنچل نے کرائی تھی۔ لگ بھگ ہم عمر ان لوگوں سے میری خوب چھننے لگی تھی اور اکثر شامیں خاص طور سے دھیریندر استھانا اور چنچل کے ساتھ گزرتی تھیں۔ اس لیے بہت فطری تھا کہ مجھے انھیں لوگوں کی یاد آئی۔ ابھی کچھ دنوں پہلے ہی یہ سبھی لوگ ایک گاڑی میں بھر کر میرے یہاں آئے تھے، شاید دھیریندر

استھانا کی شادی کی دسویں سالگرہ تھی یا ایسا ہی کوئی اور موقع۔ ہاپوڑ میں میرے ایک دوست کے فارم ہاؤس میں دیر رات تک جشن برپا ہوا تھا۔ مجھے یہ بھی امید تھی کہ یہ لوگ رازداری نہیں توڑیں گے اور ان میں سے ہر کوئی فرقہ پرستی کو لے کر لگ بھگ میری ویولینتھ پر تھا۔

اس دوپہر پانچ بجے کے آس پاس میں 'چوتھی دنیا' کے دفتر پہنچا۔ دفتر دوسری یا تیسری منزل پر تھا اور تنگ سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے آپ اس بڑے ہال نما کمرے میں پہنچتے تھے جس میں یہ سارے لوگ اپنی اپنی کرسی میزوں پر جھکے کام کر رہے ہوتے تھے۔ چنچل کی نظریں مجھ سے ٹکرائیں اور میں نے آنکھوں سے انھیں باہر آنے کا اشارہ کیا۔ دوسرے لوگ ابھی مجھے دیکھ کر کچھ کہتے ہم سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے۔ آگے آگے میں اور میرے پیچھے پیچھے چنچل۔ نیچے تھوڑی دور پر میری گاڑی کھڑی تھی اور مجھے دیکھ کر ڈرائیور اور گنر چوکنے ہوئے لیکن میں نے انھیں ہاتھ ہلا کر رکنے کے لیے کہا۔ میں اور چنچل فٹ پاتھ پر آگے بڑھ چلے۔ اس زمانے کا لکشمی نگر آج کی طرح اونچے اونچے کھمبوں پر ٹکی میٹرو لائنوں اور فلائی اووروں والا لکشمی نگر نہیں تھا، بھیڑ بھاڑ بھی آج کے مقابلے بہت کم تھی۔ ہم فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ایک ریستراں تک آئے۔ چنچل میرے چہرے سے سمجھ گئے تھے کہ کوئی گمبھیر معاملہ ہے اس لیے بولے بغیر وہ میرے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ نسبتاً کم بھیڑ بھاڑ والے ایک ریستراں میں ہم گھسے اور ایک کونے کی میز پر جا کر بیٹھ گئے۔

اگلے پندرہ بیس منٹ تک میں بولتا رہا اور وہ چپ چاپ سنتے رہے۔ ان کے چہرے کی گمبھیرتا اور اتار چڑھاو سے یہ واضح تھا کہ وہ نہ صرف اس واردات کی سنگینی کو سمجھ رہے تھے بلکہ انھیں اس کی اخباری اہمیت کا بھی احساس تھا۔ میرا بیان اور ہماری چائے ایک ساتھ ختم ہوئے، ہم نے بل ادا کیا اور واپس 'چوتھی دنیا' کے دفتر پہنچے۔ ہمارے گھستے ہی اندر بیٹھے لوگوں کی متجسس نگاہیں ہم پر ٹک گئیں لیکن ان سب کو نظر انداز کرتے ہوئے چنچل مجھے لیے ہوئے سیدھے ایڈیٹر سنتوش بھارتی کے کیبن میں داخل ہو گئے۔

خوش قسمتی سے سنتوش بھارتی خالی بیٹھے تھے۔ چنچل نے تھوڑی سی تمہید باندھی اور پھر کمان میرے ہاتھ میں سونپ دی۔ میں نے کیفیٹیریا میں چنچل کو سنائی گاتھا ایک بار پھر دہرائی۔ مجھے پتا تھا کہ چنچل کی طرح سنتوش بھارتی بھی فرقہ پرستی کے سوال پر ترقی پسند فکر کے حامل ہیں اس لیے مجھے انھیں سمجھانے میں بہت محنت نہیں کرنی پڑی کہ یہ ایک بہت گمبھیر معاملہ ہے اور اگر میڈیا نے مضبوطی سے اسے نہیں اٹھایا تو اسے دبا دیا جائے گا اور ہاشم پورہ کے قاتلوں کو کسی طرح کی سزا دلانا ناممکن ہو جائے گا۔

سنتوش بھارتی ہر طرح سے متفق تھے، انھیں خبر کی اہمیت بھی معلوم تھی اور یہ بھی پتا تھا کہ اس خبر کو سب سے پہلے چھاپنے پر ان کے کم اشاعت والے ہفتہ روزہ اخبار کو کس طرح کا بریک ملنے والا تھا۔

ایک بار یہ طے ہو جانے کے بعد کہ 'چوتھی دنیا' اس سٹوری کو اپنے اخبار میں چھاپے گا، دو مسئلے سامنے آئے۔ پہلا تو یہ کہ اس کام پر کسے لگایا جائے۔ چنچل اور سنتوش بھارتی نے آپس میں مشورہ کر ویریندر سینگر کو چنا۔ میں پچھلے کچھ مہینوں سے ویریندر سینگر کو دیکھ رہا تھا اور ان کا لکھا پڑھ رہا تھا۔ مجھے یہ انتخاب ہر طرح سے مناسب لگا۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ ہفت روزہ اخبار 'چوتھی دنیا' ہر ہفتے جمعرات کو چھپ کر آ جاتا تھا اور جمعے اور ہفتے تک اسٹالوں پر پہنچ جاتا تھا۔ آج اس کا پہلا صفحہ چھپ رہا تھا اور دیر رات تک چھپائی ختم ہو جانے والی تھی۔ اگر 'چوتھی دنیا' کو اس معاملے میں پہل لینی تھی تو تیزی سے کارروائی درکار تھی۔ سنتوش بھارتی اور چنچل دونوں سرگرم ہو گئے، کچھ لوگ کمرے میں آئے اور گئے، اور میں چپ چاپ بیٹھا اس کارروائی کو دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جب میں وہاں سے اٹھا تب تک پریس کو یہ آدیش پہنچ چکا تھا کہ کور کی چھپائی فوراً روک دی جائے اور یہ بھی طے ہو گیا کہ اسی رات ویریندر سینگر میرے گھر آئیں گے اور 'چوتھی دنیا' ایک دن بعد اسٹال پر پہنچے گا۔

رات لگ بھگ ساڑھے نو دس بجے ویریندر سینگر میرے گھر پہنچے اور ایک بار پھر وہی

سب ہوا جو کچھ دنوں پہلے ارُن وردھن کے آنے پر ہوا تھا۔ ہم نے تین چار گھنٹوں تک بیٹھ کر ہاشم پورہ کی گاتھا ایک بار پھر سے لکھی۔ اس بار کام کرنا آسان تھا کیونکہ ارُن وردھن کے ساتھ بیٹھ کر لکھنے کی وجہ سے بہت ساری چیزیں صاف ہو چکی تھیں۔ رپورٹ میں کئی کمنٹ میرے اور ضلع مجسٹریٹ نسیم زیدی کے خلاف بھی ڈالے گئے تاکہ کسی کو شک نہ ہو کہ اس کا سورس کیا ہے۔ لگ بھگ ڈھائی تین بجے رات میں ویریندر سینگر میرے گھر سے اپنے کاغذ پتر سمیٹ کر چلے گئے اور کئی دنوں بعد پہلی بار میں مطمئن ہو کر گہری نیند سویا۔

❁ ❁ ❁

6

اک بازوے قاتل ہے کہ خوں ریز بہت ہے

8/ اکتوبر 1987 کو سی آئی ڈی کے ڈی آئی جی، جنگی سنگھ نے کے کے بخشی، ہوم سکریٹری، حکومت اتر پردیش کو اپنے نیم سرکاری خط، CB 294/87، میں لکھا:

"کرائم برانچ کے ذریعے نہایت دقیق تجزیے سے جو ثبوت جمع کیے گئے ہیں اس سے، تھانہ سول لائنس کے ریکارڈوں کی چھان بین اور ہنڈن ندی سے ملنے والی بارہ لاشوں کی پہچان کرانے سے پہلا ثبوت یہی معلوم ہوتا ہے کہ میرٹھ نگر میں مورخہ 21 مئی 87 کو ہاشم پورہ علاقے سے لگے ہوے سرسوتی مندر، سورج کنڈ روڈ کے ایک مکان پر شری پربھات کمار کوشک کی موت کسی نامعلوم شخص کی بندوق کے فائر سے ہوئی تھی۔ مذکورہ مقتول شری پربھات کمار کے ساتھ ایک دو لڑکے اور بھی گھائل ہوے تھے۔ شری پربھات کمار مقامی فوج کے میجر شری ستیش چندر کوشک کے بھائی ہیں اور شریمتی شکنتلا شرما کے بھانجے ہیں، جو بھارتیہ جنتا پارٹی کی نیتا ہیں اور ان کا بیٹا بھی اس حادثے میں گھائل ہونا بتایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں تھانہ سول لائنس، ضلع میرٹھ میں درج ایف آئی آر، فرد جرم نمبر 224/87، دفعہ 307/302 کے مطالعے سے بھی پتا چلتا ہے کہ شری پربھات کمار کا پنچ نامہ اور پوسٹ مارٹم کی کارروائی نہیں ہوئی ہے۔ میجر

کوشک کے بارے میں یہ ثبوت بھی ملا ہے کہ مورخہ 22 مئی 87 کو وہ بھی شام پانچ بجے جائے واردات ہاشم پورہ پر موجود تھے جہاں سے پیلے رنگ کے ٹرک میں لوگوں کو بٹھا کر مرادنگر نہر پر لایا گیا تھا اور کچھ کو مرادنگر نہر میں اور کچھ کو ہنڈن نہر میں مار کر پھینک دیا گیا تھا۔''

ایس کے رضوی، پولیس سپرنٹنڈنٹ، کرائم برانچ، سی آئی ڈی نے 22 جون 1989 کو انگریزی میں ہاشم پورہ کے واقعات پر ایک تفصیلی نوٹ وزیراعظم کے آفس کے لیے تیار کیا تھا۔ تینتیس صفحوں میں ٹائپ شدہ اس نوٹ کے پیراگراف 11 اور 12 میں درج ہے:

''اس سلسلے میں یہ ذکر کیا جا سکتا ہے کہ واردات کے فوراً بعد اخباروں میں یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ اسی علاقے میں تعینات میجر ستیش چندر کوشک کا ایک بھائی 21 مئی 87 کو ہاشم پورہ محلے میں بندوق کی گولیوں سے لگے زخموں سے مرا تھا۔ یہ کہا گیا کہ اپنے ذاتی نقصان کے سبب میجر ستیش چندر شرما نے ہاشم پورہ کے باشندوں کا قتل اپر گنگا اور ہنڈن نہروں پر کرایا تھا۔ اس سیاق میں مقتول پربھات کوشک کے پتا شری دیپ چندر شرما سے بھی پوچھ تاچھ کی گئی۔ شری دیپ چندر شرما، ساکن سرسوتی مندر، سورج کنڈ روڈ، میرٹھ شہر نے بیان دیا کہ ان کے بیٹے پربھات کوشک کو لگ بھگ ساڑھے نو بجے گولی لگی، جب وہ اسی علاقے میں اپنی موسی کے گھر کی چھت پر کھڑا تھا۔ لگتا تھا کہ گولی پڑوسی محلے عبدالوالی سے آئی تھی۔ شری دیپ چندر شرما نے یہ بھی بیان دیا کہ ان کے بیٹے پربھات کوشک کی لاش کا پوسٹ مارٹم نہیں کرایا گیا کیونکہ دنگوں کے دوران پوسٹ مارٹم میں بہت زیادہ دیر ہو رہی تھی۔'' !

کرائم برانچ، سی آئی ڈی، لکھنؤ کے افسر جنگی سنگھ نے پہلی پروگریس رپورٹ، نمبر CB-294/87، CB-311/8 جو 2 جون 1987 کو ماتا پرساد، چیف سکریٹری، ہوم ڈپارٹمنٹ، حکومت اتر پردیش کو بھیجی اس میں میجر ستیش چندر کوشک کے بھائی پربھات

کمار کے قتل کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ بہت سرسری سی رپورٹ ہے۔ اس کے فوراً بعد کرائم برانچ، سی آئی ڈی نے ایک اور مختصر رپورٹ تیار کی اور اسے پولیس ڈائرکٹر جنرل آفس کو بھیجا گیا۔ اس رپورٹ کے پیراگراف 2 میں درج ہے:

''ابھی تک کی جانچ سے یہ پتا چلتا ہے کہ میرٹھ نگر میں 21 مئی 87 کو ہاشم پورہ علاقے سے لگے ہوئے سرسوتی مندر، سورج کنڈ روڈ کے ایک مکان پر پربھات کمار کوشک کی موت کسی نامعلوم بندوق کے فائر سے ہوئی تھی۔ اس سانحے میں ایک دولڑکے اور بھی گھائل ہوئے تھے۔ شری پربھات کمار بھارتیہ جنتا پارٹی کی نیتا شکنتلا شرما کے بھانجے اور لوکل آرمی کے میجر شری ستیش چندر کوشک کے بھائی تھے۔ جانچ سے یہ ثبوت ملا ہے کہ مورخہ 22 مئی 87 کو شری ستیش چندر کوشک جائے واردات ہاشم پورہ پر موجود تھے، جہاں سے پیلے رنگ کے ٹرک میں بٹھا کر کچھ لوگوں کو مراد نگر نہر پر اور کچھ کو ہنڈن نہر میں مار کر پھینک دیا گیا تھا۔ ابھی تک جانچ سے لگ بھگ تیس لوگوں کو گولی مار کر قتل کیا جانا اور اس واردات سے سات آدمیوں کا زندہ بچنا پایا گیا ہے۔''

کرائم برانچ، سی آئی ڈی کی دوسری پروگریس رپورٹ، جو اپر پولیس سپرنٹنڈنٹ سدامالال اگروال کے ذریعے 24 ستمبر 1987 کو دستخط شدہ ہے اور 8 اکتوبر 1987 کو بھیجی گئی ہے، کے 'نتیجے' میں بہت واضح لکھا گیا ہے:

''کرائم برانچ نے مذکورہ واردات میں بہت ہی گہرائی اور سوجھ بوجھ سے جو ثبوت فراہم کیے ہیں یا ہنڈن نہر سے ملی بارہ لاشوں کی پہچان کرائی ہے اور تھانہ سول لائن کے ریکارڈوں کی جو چھان بین کی ہے ان سے پہلی نظر میں یہی پتا چلتا ہے کہ شہر میں مورخہ 21 مئی 87 کو ہاشم پورہ علاقے سے لگے ہوئے سرسوتی مندر، سورج کنڈ روڈ کے ایک مکان پر شری پربھات کمار کوشک کی موت کسی نامعلوم کی بندوق کے فائر سے ہوئی تھی۔ مقتول شری پربھات کمار کے ساتھ ایک دولڑکے اور بھی گھائل ہوئے تھے۔ شری

پربھات کمار مقامی فوج کے میجر شری ستیش چندر کوشک کا بھائی ہے اور شریمتی شکنتلا شرما کا بھانجا ہے جو بھارتیہ جنتا پارٹی کی نیتا ہیں۔ان کا بیٹا بھی اس حادثےمیں گھائل ہونا بتایا جاتا ہے۔اسی طرح اخباروں وغیرہ کے ذریعے سے یہ افواہ ہے کہ میجر شری ستیش چندر کوشک کے پہلے سے تیار منصوبے سے ہی،انتقام کے جذبے سے یہ قتل کیے گئے ہیں۔اس سلسلے میں تھانہ سول لائنس، ضلع میرٹھ میں درج ایف آئی آر فرد جرم نمبر 224/87 دفعہ 307/302 کے مطالعے سے بھی پتا چلتا ہے کہ شری پربھات کمار کا پنچ نامہ اور پوسٹ مارٹم کی کارروائی نہیں ہوئی ہے۔میجر کوشک کے متعلق یہ ثبوت بھی ملا ہے کہ مورخہ 22 مئی 87 کو وہ بھی شام پانچ بجے جائے واردات ہاشم پورہ پر موجود تھے۔"

یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ پربھات کمار اور میجر ستیش کمار کے نام کے ساتھ کہیں شرما اور کہیں کوشک لفظ کا استعمال ہوا ہے،اسی طرح بھاجپا نیتا شکنتلا کے ساتھ بھی دونوں ٹائٹل استعمال کیے گئے ہیں۔

ایس کے رضوی، پولیس سپرنٹنڈنٹ، کرائم برانچ، سی آئی ڈی کے دستخط سے 29 فروری1988 کو بھیجی گئی تیسری پروگریس رپورٹ میں عبدالحمید ولد عبدالغفور کے بیان کا ذکر ہے جس میں اس نے اپنی گرفتاری کے دوران ایک فوجی افسر ستیش کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔

3 اگست 1994 کو سی آئی ڈی نے اپنی آخری پروگریس رپورٹ اتر پردیش سرکار کو بھیجی۔130 فل اسکیپ صفحوں میں ٹائپ شدہ یہ رپورٹ ایک لچر اور غیر پیشہ ورانہ تفتیش کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔جانچ رپورٹ میں جگہ جگہ فوج، خاص طور سے حصہ لینے والی ٹکڑی کے کمانڈر میجر بی ایس پٹھانیا کی غیر قانونی سرگرمیوں کا ذکر ہے لیکن پوری تفتیش میں کہیں بھی ان کی اس غیر معمولی سرگرمی کو ہاشم پورہ کانڈ میں مجرم پائے گئے پی اے سی کرمیوں کی کرتوتوں سے جوڑنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔اس رپورٹ کے صفحہ 54 پر پولیس

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ارن کمار گپتا، جو میرٹھ دنگوں کے دوران ہاشم پورہ میں سیکٹر آفیسر کے طور پر تعینات تھے، کے بیان میں ایک بار 21 مئی 87 کو پربھات شرما کے قتل کا ذکر ہے لیکن اس قتل کا ہاشم پورہ کانڈ سے کیا تعلق ہوسکتا ہے اس کی پڑتال کرنے کا کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ جانچ رپورٹ کے صفحہ 70 پر یہ تبصرہ قابل ذکر ہے:

"کرائم برانچ کی جانچ کے دوران فوج کے افسران اور کرمچاریوں کے مندرجہٴ بالا بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فوج کے ادھیکاری اور کرمچاری متعلقہ معاملے کی جانچ کے کام میں پورا تعاون نہیں کر رہے تھے۔"

آخری رپورٹ، جس کے ذریعے سے کرائم برانچ، سی آئی ڈی نے اپنی تفتیش کا نچوڑ پیش کیا ہے اور اس تفتیش میں مجرم پائے گئے لوگوں کے خلاف عدالت میں فردِ جرم داخل کرنے کی تیاری کی ہے، کے صفحہ 125 پر درج سی آئی ڈی کا یہ نتیجہ بڑا ہی دلچسپ ہے:

"تجزیے میں ایسا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوا ہے جس سے یہ پتا لگتا کہ مندرجہٴ بالا گرفتار آدمیوں کے قتل کا حکم کسی سینئر افسر کے ذریعے دیا گیا ہے۔ شواہد سے یہ قتل کرنے کا جرم صرف انھی لوگوں کی مسخ شدہ ذہنیت کا عکاس محسوس ہوتا ہے جس کے لیے صرف 'کرتا' (کرنے والے) کو ہی ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے، کسی اور کو نہیں۔"

میجر بی ایس پٹھانیا نے میرٹھ کے دنگو کے دوران روزانہ آرمی ہیڈ کوارٹر کو اپنی کارگزاریوں کی رپورٹ بھیجی جو یونٹ وار ڈائری کے روپ میں ہاشم پورہ سے متعلق دستاویزوں میں مہیا ہے۔ پٹھانیا کی سبھی رپٹیں غیر قانونی حرکتوں کا اعتراف ہیں۔ قانون کے بارے میں ایک کم جانکاری رکھنے والے فوجی افسر سے آپ یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ ان حرکتوں میں ملوث رہے جو ہندوستانی آئین اور قانونوں کے تحت جرم کے زمرے میں آتے ہوں، اور شیخی بگھارتے ہوئے اپنے ہیڈ کوارٹر کو اس کی رپورٹنگ بھی کرے، لیکن کیا سی آئی ڈی کے پیشہ ور افسران سے یہ توقع نہیں کی جانی چاہیے تھی کہ وہ اس بڑبولے اور قانون توڑنے والے افسر کو اس کے تحریری اعتراف کی بنیاد پر عدالت

کے سامنے کھڑا کریں؟ سی آئی ڈی نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ وہ میجر پٹھانیا اور دوسرے فوجی افسروں کو تفتیش کے دوران بیان دینے کے لیے بلاتے رہے لیکن برسہا برس ان میں سے کوئی تفتیش کاروں کے سامنے پیش نہیں ہوا۔ یہ تب ہوا جب شروعاتی دور میں خود راجیو گاندھی کی لیڈرشپ میں وزیراعظم کا دفتر اس جانچ کی نگرانی کر رہا تھا۔ کبھی بھی سی آئی ڈی نے وزیراعظم کے دفتر کو مطلع نہیں کیا کہ فوجی افسران جانچ میں تعاون نہیں کر رہے ہیں۔ بعد میں جب میجر پٹھانیا سی آئی ڈی کے سامنے پیش ہوا تو اس نے ان سبھی حقائق سے انکار کر دیا جن کے بارے میں اس نے خود تحریری طور پر آرمی ہیڈکوارٹر کو مطلع کیا تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے جس میجر ستیش چندر کوشک کے رول کو لے کر سی آئی ڈی نے اپنی پہلی رپورٹ سے ہی شک وشبہ کا ماحول بنا رکھا تھا، لیکن اسی سے پوری تفتیش کے دوران کوئی پوچھ تاچھ نہیں کی گئی۔

کون تھا یہ پراسرار آدمی، میجر ستیش چندر کوشک جس کے بارے میں سی آئی ڈی نے اپنے پہلے خط سے ہی یہ ذکر کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ 22 اگست 1987 کو ہاشم پورہ کی تلاشیوں کے وقت جائے واردات پر دیکھا گیا تھا؟ اس وقت میجر بی ایس پٹھانیا فوج کا کالم کمانڈر تھا اور فوج اور پولیس کی دستاویزوں کے مطابق وہاں میجر کوشک کی ڈیوٹی نہیں تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ایک دن پہلے ہی اس کے چھوٹے بھائی پربھات کمار کوشک کا قتل ہوا تھا اور اس قتل کے نامعلوم قاتلوں کے ہاشم پورہ میں ہونے کا امکان تھا۔ 22 مئی 1987 کی شام تو اسے اپنے ماں باپ کو دلاسہ دینے کے لیے گھر پر ہونا چاہیے تھا جن کا، اس کی موسی (خالا) شکنتلا شرما کی خودنوشت سوانح میں درج بیان کے مطابق، اپنے اٹھارہ سال کے بیٹے کے قتل کے کارن رو رو کر برا حال تھا۔ یہاں یہ بھی جاننا بہت ضروری ہے کہ کون تھیں شکنتلا شرما جن کا سی آئی ڈی کی الگ الگ رپورٹوں میں بار بار بھاجپا لیڈر کے روپ میں ذکر آتا ہے، اور شروع سے ہی یہ کہا جاتا رہا ہے کہ 22 مئی 1987 کی واردات کے پیچھے پربھات کمار کوشک کا قتل اور شکنتلا شرما اور میجر

ستیش چندر کوشک کا ہاتھ ہے۔ اچانک ایسا کیوں ہوا کہ تفتیش آگے بڑھنے کے ساتھ ان دونوں کا ذکر کم ہوتا جاتا ہے اور سی آئی ڈی کی آخری رپورٹ میں تو ایک ہلکے سے ذکر کے علاوہ ان کا ذکر ہی غائب ہو جاتا ہے۔ کہیں اس کے پیچھے لکھنؤ کی سرکار تو نہیں تھی؟ تفتیش کے دوران لکھنؤ میں سرکاریں بدلتی رہیں اور ہر بدلاؤ کے ساتھ تفتیش کاروں کا رخ بھی بدلتا رہا۔

شکنتلا شرما سے میری دو بار طویل ملاقاتیں ہوئی۔ اگر آپ اسّی سال کی اس عورت کو بات چیت میں تھوڑا سا اشتعال دلا دیں اور بولتے وقت اس کے ساتھ ٹوکا ٹا کی نہ کریں تو یہ عورت آپ کو نفرت، انتقامی تشدد، مذہبی تشدد اور سازشوں اور جوابی سازشوں کی ایک انوکھی دنیا میں لے جاتی ہے۔ جن دنوں میں اس عورت سے مل رہا تھا وہ اپنی سوانح لکھنے میں مصروف تھی۔ صاف ستھری تحریر میں لکھی جا رہی اس ڈائری نما سوانح میں وہ سارے چھوٹے بڑے واقعات درج ہیں جن کا اس عورت کے دل پر گہرا اثر پڑا تھا اور جنھوں نے اس کی فکر کی تعمیر میں خاص کردار ادا کیا تھا۔ خاص طور سے تقسیم ملک اور اس دوران ہوے فرقہ وارانہ فسادات نے اس پر خاصا اثر ڈالا تھا۔ ان واقعات اور اپنے باپ کے زیرِ اثر وہ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کی مہیلا شاخ میں سرگرم ہوئی اور پھر یہ سفر جن سنگھ، بھارتیہ جنتا پارٹی اور وشو ہندو پریشد تک جاری رہا۔ اس سوانح میں میرٹھ میں فرقہ پرستی کی تاریخ اور وہاں کی جن سنگھ / بھارتیہ جنتا پارٹی کی اکائی میں پھیلے ہوئے داخلی تضادات پر بھی اچھا خاصا مواد ہے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ سوانح کا پہلا ڈرافٹ 21 مئی 1987 پر آکر رکا ہوا تھا۔

21 مئی ہمارے لیے بہت اہم اس لیے ہے کہ اسی دن سورج طلوع ہونے کے ایک دو گھنٹے بعد، جب سورج پوری طرح سے اگ چکا تھا، ہاشم پورہ کی سرحد پر واقع سرسوتی مندر، سورج کنڈ روڈ والے شکنتلا کوشک کے مکان کی چھت پر، اپنے جان و مال کی حفاظت کے لیے رات بھر پہرہ دینے کی وجہ سے دیر سے جاگے پانچ نوجوانوں میں

سے ایک کی آنکھ میں ایک گولی آ کر ٹک گئی تھی۔ بھاجپا لیڈر شکنتلا شرما کا گھر محلّہ عبدالوالی سے لگا ہوا تھا۔ اس لیے فرقہ وارانہ فسادات کے دوران اپنے لوگوں کی حفاظت کا ذمہ وہ لوگ خود ہی اٹھاتے تھے۔ شکنتلا شرما اور ان کی بہن کے بچے، جو اُن کے گھر کے نزدیک ہی رہتی تھیں، باری باری سے چھت پر پہرہ دیتے تھے۔ حالانکہ آنکھ میں گولی لگنے کے بعد اس نوجوان کو آناً فاناً میں میرٹھ میڈکل کالج پہنچایا گیا لیکن وہاں پہنچتے پہنچتے اس کی موت ہو چکی تھی۔ پانچ بھائیوں میں سب سے چھوٹا پربھات کمار شرما نام کا یہ نوجوان شکنتلا کوشک کی بہن کا بیٹا تھا اور اس کا سب سے بڑا بھائی ستیش چندر شرما میرٹھ چھاونی میں ہی میجر کے عہدے پر تعینات تھا۔ اس کے ساتھ دو اور لڑکے بھی اس حادثے میں گھائل ہوئے جن میں ایک اس کا خلیرا بھائی یعنی شکنتلا کوشک کا بیٹا اُمیج تھا۔ اس سلسلے میں میرٹھ کے تھانہ سول لائنز میں مقدمہ جرم نمبر 224/87، دفعہ 307/302 تعزیرات ہند کے تحت درج ہوا۔ نیتا شکنتلا کوشک اور میجر ستیش شرما کے رسوخ کا انداز اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ پوسٹ مارٹم کرائے بغیر پریوار والے، زبردستی اور پولیس کے اعتراضات کو نظر انداز کرتے ہوئے پربھات کی لاش اسپتال سے اٹھالے گئے۔ اسی واردات پر آ کر شکنتلا شرما کے ہاتھ سوانح تحریر کرتے ہوئے ٹھٹک کر رک جاتے ہیں۔ کیا اتھل پتھل رہی ہوگی مصنفہ کے دل میں، اور کیوں اس نے اس نقطے پر آ کر اپنی ڈائری بند کر دی، اسے سمجھنا بہت ضروری ہے۔

❁ ❁ ❁

حواشی:

1. "In this connection it may be pointed out that soon after the incident there was some speculation in the press that a brother of a locally posted Major Satish Chandra Kaushik had died of gunshot injuries on 21.5.87 in Mohalla Hashimpura. It was said that as a consequence of this personal tragedy Major Satish

Chandra Kaushik engineered the murder of residents of Hashimpura on the Upper Ganga and Hindan Canals. In this connection Sri Deep Chandra Sharma father of the deceased Prabhat Kaushik, was also examined.

Sri Deep Chandra Sharma r/o Saraswati Mandir, Suraj Kund road, Meerut City stated that his son Prabhat Kaushik received bullet injuries on 21-5-87 at about 9.30 while standing on the roof his aunty's house in the same locality. The bullet appeared to have come from the direction of the neighbouring Mohalla Abdul Wali. Sri Deep Chandra Sharma also stated that no postmortem was conducted on the dead body of his son Prabhat Kaushik because of the long delay occurring in postmortem during the riot period."

(Extract from the note prepared for Prime Minister Office by S K Rizvi , S.P. C.B. C.I.D. dated 22nd June 1989)

7

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

بھارت میں نظامِ قانون قائم کرنے کا پورا ڈھانچہ برطانوی ماڈل پر کھڑا کیا گیا ہے۔ اس ڈھانچے کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں پولیس اور فوج کے رول کو بڑے واضح اور الگ الگ خانوں میں رکھا گیا ہے۔ برٹش روایت کے مطابق اس میں فوج پوری طرح سے سول ایڈمنسٹریشن کی ماتحت رکھی گئی ہے۔ خوش قسمتی سے آزادی کے فوراً بعد ہمیں ایک ایسی سیاسی لیڈرشپ ملی جس نے، اگر کبھی ان کے من میں ایسی خواہش رہی بھی ہو، فوجی افسروں کو سختی کے ساتھ سول انتظامیہ میں دخل دینے سے روکا۔ ہمارے پڑوسی اور ہم سے کٹ کر بنے پاکستان نے سول بالادستی قائم نہیں رکھی اور اپنے وجود کا آدھا زمانہ اس نے فوجی حکومتوں کے اندر کاٹا ہے۔ فوجی حکمرانوں نے اس کی کیا گت بنائی ہے یہ کسی سے چھپا نہیں ہے۔ ہم اگر ایک جمہوریہ بنے ہوئے ہیں تو اس کے پیچھے سب سے بڑی وجہ سول اور فوجی سرگرمیوں کے بیچ 1947 میں کھینچی گئی لکشمن ریکھا کا قائم رہنا ہے۔ سول اور فوجی انتظامیہ کے بیچ بالادستی کا پہلا فیصلہ کن تصادم آزادی کی سانجھ پر ہی ہوا۔ یہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہندوستانی افواج میں افسروں کو بھرتی کرنے کی برٹش پالیسی

کے سبب 15 اگست 1947 کو کامناسب سینیرٹی اور تجربے والے ایسے ہندوستانی افسروں کی بے حد کمی تھی جنھیں مختلف سطحوں کی کمان سونپی جا سکے۔ اس لیے شروعاتی برسوں میں سینئر کمان اور اسٹاف کے عہدوں پر گورے افسر ہی تعینات رہے۔ انھی میں سے سب سے اہم کمانڈر اِن چیف جنرل لاک ہارٹ نے 15 اگست 1947 کو لال قلعے پر پرچم کشائی کے دوران عام جنتا کو تقریب میں شرکت کرنے سے روکنے کا حکم جاری کر دیا تھا۔ وزیراعظم جواہر لال نہرو کو جب یہ پتا چلا تو انھوں نے نہ صرف یہ حکم ردّ کرایا بلکہ لاک ہارٹ کو سخت لہجے میں یاد دلایا کہ ''فوج میں لاگو کی جانے والی کسی بھی پالیسی میں بھارت سرکار کی رائے اور اس کے ذریعے طے کی گئی پالیسیوں کی بالادستی رہے گی۔''[1]

اس کے کچھ ہی دنوں بعد جب جوناگڑھ میں فوج بھیجنے کا سوال اٹھا اور انگریز فوجی افسروں نے اس کی مخالفت کی تب بھی پنڈت نہرو اور سردار پٹیل نے ان کے اعتراض کو نظرانداز کر دیا۔ یہاں ابتدائی برسوں کے ہی ایک اور واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا جس میں انڈین اوریجن کے ایک جنرل کو لکشمن ریکھا کا احساس کرایا گیا۔ فوج کے اوّلیں، ہندوستانی نسل کے کمانڈر اِن چیف جنرل کریپا نے اقتصادی ترقی جیسے پالیسی کے معاملوں پر کھلے عام اپنی رائے دینی شروع کر دی تھی اور جیسے ہی کابینہ کے کچھ اراکین نے وزیراعظم کو اس جانب متوجہ کیا، پنڈت نہرو نے کریپا کو خط لکھ کر واضح کر دیا کہ یہ ان کا میدان نہیں ہے اور انھیں ان تبصروں سے بچنا چاہیے۔ ان تجربوں سے فوج نے سبق لیا اور سول انتظامیہ کی بالادستی قبول کرتے ہوئے پالیسی کے معاملے سرکار پر چھوڑ دیے۔ مذکورہ واقعات کا ذکر میں صرف اس لیے کر رہا ہوں کہ یہ واضح ہو سکے کہ 1987 میں میرٹھ فسادات میں فوج نے جو کچھ کیا وہ نہ صرف اس کے دائرۂ اختیار کے باہر تھا بلکہ ملک کے قوانین کی واضح خلاف ورزی بھی تھا۔

1860 کے آس پاس بنائے گئے قانونوں میں سے سب سے اہم انڈین پینل کوڈ

(آئی پی سی)، کوڈ آف کریمنل پروسیجر (سی آر پی سی) اور انڈین پولیس ایکٹ کے پرویژنس کے تحت ہی بنیادی طور پر امن عامہ سے متعلق سنگین حالات سے نمٹا جاتا ہے۔ آزادی کے بعد نافذ ہوے ہندوستانی آئین نے ہندوستانی شہریوں کو بہت سارے بنیادی حقوق دیے ہیں اور اب یہ سارے قوانین آئین کے ذریعے طے شدہ حدود کے اندر رہ کر ہی کام کر سکتے ہیں۔ قوانین کے تحت صوبائی سرکاریں، ضلع مجسٹریٹ یا پولیس کمشنر سول افسران کی مدد کے لیے فوج کو طلب کرتے ہیں۔ اس کی قانونی توضیح یہ ہو سکتی ہے کہ اگر کسی علاقے میں امن عامہ بگڑنے کا سنگین مسئلہ پیدا ہو جائے اور مذکورہ افسران کو یہ یقین ہو کہ ان کے پاس فراہم پولیس فورس امن عامہ قائم کرنے میں ناکام ہے تو وہ سول افسران کی مدد کے لیے فوج کو بلا سکتے ہیں۔ اس معاملے میں قانون بہت واضح ہے۔ مذکورہ بالا پرووِیژن کے تحت فوج سول افسران کی مدد کے لیے ہی بلائی جاتی ہے۔ اسے کسی کو بھی گرفتار کرنے یا تلاشی لینے جیسے پولیس کے اختیارات خود بخود حاصل نہیں ہو جاتے۔ یہاں سی آر پی سی کی دفعات 130 اور 131 کا ذکر ہمارے لیے مناسب ہوگا۔ دفعہ 130 میں نظم ہے کہ اگر کوئی غیر قانونی بھیڑ کسی اور طریقے سے تتر بتر نہ کی جا سکے تو موقعے پر موجود سب سے سینئر ایگزیکیٹو مجسٹریٹ اسے مسلح افواج کے ذریعے منتشر کرا سکتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں یہ افسر کسی فوجی ٹکڑی کے کمان افسر کو فورس کا استعمال کر کے اس غیر قانونی بھیڑ کو منتشر کرنے کا حکم دے گا جس کے تحت گرفتاری کا اختیار بھی ہوگا۔ فوجی افسروں کو دفعہ 131 سی کے تحت مجسٹریٹ کے حکم کے بغیر بھی یہ سب کرنے کا اختیار ہے۔ دفعہ 131 میں پرووِیژن ہے کہ کسی غیر قانونی مجمع کو مسلح فورس کا کمیشنڈ یا گزٹیڈ افسر منتشر کرا سکتا ہے اور اس میں شامل کسی بھی شخص کو گرفتار کر سکتا ہے۔ لیکن اس میں ایک پیچ ہے۔ دفعہ 131 میں واضح کیا گیا ہے کہ اس اختیار کا استعمال اسی صورت حال میں کیا جا سکتا ہے جب اس افسر کا رابطہ کسی ایگزیکیٹو مجسٹریٹ سے ہونا ممکن نہ ہو سکے۔ اسی دفعہ کے تحت یہ بھی نظم کیا گیا ہے کہ اپنی کارروائی کے دوران جیسے ہی فوجی افسر کا مجسٹریٹ

سے رابطہ قائم ہو جاتا ہے، اس کی کارروائی مجسٹریٹ کے اختیار کے تحت آ جاتی ہے۔

کیا 18 مئی سے 22 مئی 1987 تک میرٹھ میں ایسے حالات تھے جہاں فوجی افسروں کے لیے مجسٹریٹ سے رابطہ قائم کرنا ناممکن تھا؟ اگر آپ میرٹھ شہر کا جغرافیہ جانتے ہیں اور آپ کو یہ حقیقت معلوم ہو کہ ہر فساد کی طرح ان فسادات کے دوران بھی اس علاقے کو چھوٹے چھوٹے سیکٹروں میں بانٹا گیا تھا اور ہر سیکٹر میں چوبیسوں گھنٹے کوئی نہ کوئی ایگزیکٹو مجسٹریٹ موجود رہتا تھا، آپ اسے قبول نہیں کریں گے۔ 22 مئی 1987 تک تو میرٹھ پوری طرح سے چھاونی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ شکنتلا شرما کے بھانجے اور میجر ستیش چندر کوشک کے چھوٹے بھائی پربھات کا قتل ایک دن پہلے ہی ہوا تھا اور جیسا خود سی آئی ڈی کے ڈی آئی جی جنگی سنگھ اور ایس پی، ایس کے رضوی نے اتر پردیش حکومت اور وزیر اعظم کے دفتر کو بھیجی رپورٹوں میں لکھا تھا، اس قتل اور ہاشم پورہ کانڈ کے بیچ گہرا داخلی تعلق تھا۔ 22 مئی کی صبح کے میرٹھ کے اخباروں کی سرخیوں میں اس قتل کی خبر چھائی ہوئی تھی۔ ایسے کسی بھی موقعے پر جیسا ہونا چاہیے تھا، ظاہر ہے اس بار بھی ہوا۔ پورے شہر کو چھوٹے چھوٹے سیکٹروں میں بانٹ کر مجسٹریٹوں اور گزٹیڈ پولیس افسروں سے پاٹ دیا گیا تھا، ایسے میں اگر کوئی فوجی افسر دفعہ 131 سی آر پی سی کے مطابق کسی ایگزیکٹو مجسٹریٹ سے رابطہ کرنا چاہتا تو اسے زیادہ سے زیادہ دس سے پندرہ منٹ لگتے۔ مجھے میرٹھ پولیس کنٹرول روم کے دستاویزوں کی چھان بین کرنے کا موقع ملا تھا اور میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ 20 مئی 1987 کے بعد سے میرٹھ کی شاہراہیں پولیس اور انتظامیہ کے افسران سے پٹی پڑی تھیں اور کوئی بھی فوجی افسر آسانی سے دس پندرہ منٹ میں مجسٹریٹ سے رابطہ کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر مجسٹریٹ کی گاڑی پر پولیس کا وائرلیس سیٹ لگا ہوا تھا جس کے ذریعے وہ کنٹرول روم سے جڑا ہوا تھا۔ فوجی کالم کے کمانڈر کا بھی، پولیس کے ذریعے دیے گئے وائرلیس سیٹ کے ذریعے سے، کنٹرول روم سے مسلسل ملاپ بنا ہوا تھا۔

میرٹھ میں فسادات کا یہ دور 16 مئی کو شروع ہوا۔ پچھلے تجربوں سے سبق لیتے ہوئے تیسرے ہی دن میرٹھ انتظامیہ نے فوج بلالی۔ میرٹھ چھاونی سے 18 گرینیڈیر کی بی کمپنی اس ڈیوٹی کے لیے بھیجی گئی۔ سی آئی ڈی کی رپورٹوں میں جگہ جگہ میجر بی ایس پٹھانیا نام کے فوجی افسر کا ذکر آتا ہے اور انھیں دھیان سے پڑھنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہاشم پورہ میں تلاشی لیتے وقت موجود فوجی ٹکڑی کی کمان میجر پٹھانیا کے پاس تھی۔ میجر پٹھانیا یا دوسرے فوجی افسروں نے اپنی کارگزاریوں کی جو رپورٹیں اپنے اعلیٰ افسران کو بھیجی تھیں ان میں کہیں بھی اس بات کا ذکر نہیں تھا کہ جن تلاشیوں، گرفتاریوں یا برآمدگیوں کا دعویٰ وہ کر رہے ہیں وہ کسی مجسٹریٹ کے حکم پر یا اس کی موجودگی میں انجام دی گئی ہیں۔ یونٹ کی وار ڈائری میں مورخہ 22 مئی 87 کو میجر پٹھانیا کے ذریعے بھیجا گیا پیغام درج ہے جس میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ اس دن محلّہ ہاشم پورہ کا کنٹرول ایس ڈی ایم نے فوج کے سپرد کر دیا تھا۔ قانوناً ایسا نہیں کیا جا سکتا اور ظاہر ہے یہ اطلاع میجر پٹھانیا کے ذریعے قانون کی ادھ کچری سمجھ کی وجہ سے ہی بھیجی گئی تھی۔

امن عامہ غارت ہونے کی سنگین صورت حال پیدا ہونے پر فوج کو بنیادی طور پر فسادیوں کے دلوں میں خوف پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضلعے کے سول افسران موجود فوجی ٹکڑیوں کا استعمال بنیادی طور پر فلیگ مارچ، پیٹرولنگ اور تلاشیوں کے دوران علاقوں کی گھیرابندی کے لیے کرتے ہیں۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ کسی علاقے کی فوج یا پی اے سی جیسی مسلح پولیس فورس کے ذریعے گھیرابندی کرا کے، سول پولیس کے لوگ گھروں کے اندر تلاشی کے لیے گھستے ہیں۔ کئی بار چنوتیوں اور خطروں کا اندازہ کر کے فوجی جوانوں کو گھنی آبادی والے محلوں میں اونچی چھتوں پر تعینات کیا جاتا ہے تاکہ وہ وہاں سے آس پاس کے علاقے کی نگرانی کر سکیں اور ضرورت پڑنے پر کسی ممکنہ خطرے سے نمٹ سکیں۔ ضروری ہونے پر وہ تلاشی لینے والے گروہ کے ساتھ گھروں کے اندر بھی گھستے ہیں لیکن ان کا بنیادی کام تلاشی لینے والوں کی حفاظت اور

فسادیوں کے دلوں میں خوف پیدا کرنا ہوتا ہے۔ کسی بھی صورت حال میں ہندوستانی آئین اور سی آر پی سی امن عامہ کی بحالی کے دوران فوج کے کسی خودمختار رول کا تصور نہیں دیتے۔ اس سے استثنیٰ کی واحد مثال 'آرمڈ فورسز اسپیشل پاورز ایکٹ' ہے، جس کے تحت فوج کو تلاشی لینے اور گرفتار کرنے جیسے پولیس کے اختیارات دیے گئے ہیں۔ لیکن آرمڈ فورسز اسپیشل پاورز ایکٹ صرف انھی علاقوں میں لاگو کیا جا سکتا ہے جن کے 'ڈسٹربڈ ایریا' ہونے کا اعلان کیا گیا ہو۔ ایسا اس قانون کے بننے کے بعد بنیادی طور پر کشمیر اور نارتھ ایسٹ کے صوبوں میں ہی کیا گیا ہے، جہاں ہونے والی شورشیں عمومی امن عامہ کے انتظام کے زمرے میں نہیں آتیں اور جدید ترین ہتھیاروں سے لیس اور فوجی تربیت پائے ہوئے باغیوں سے نمٹنا سول پولیس کے بوتے میں نہیں ہوتا۔ اس لیے وہاں فوج کو آرمڈ فورسز اسپیشل پاورز ایکٹ کے تحت خصوصی اختیار دے کر بھیجنا کچھ حد تک منطقی ہے۔ 22 مئی 1987 کی شام 5 بجے جب ہاشم پورہ میں تلاشیاں چل رہی تھیں تب یقینی طور پر نہ تو میرٹھ کے ڈسٹربڈ ایریا ہونے کا اعلان کیا گیا تھا اور نہ ہی وہاں آرمڈ فورسز اسپیشل پاورز ایکٹ کے پرووِیژنس کے تحت فوج کو تلاشیوں اور گرفتاریوں کا کوئی اختیار حاصل تھا۔ اس لیے 22 مئی 1987 کو میجر پٹھانیا کے ذریعے بھیجا گیا یہ پیغام کہ ایس ڈی ایم نے ہاشم پورہ کا کنٹرول فوج کو سونپ دیا ہے، نہ صرف گمراہ کن ہے بلکہ اس خاص ذہنیت کا عکاس ہے جس میں فوجی افسران مبتلا رہتے ہیں اور جس کا تھوڑا سا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔

آرمی ہیڈکوارٹر کی اسی وار ڈائری میں مورخہ 22 مئی 87 کو 17 بجے یہ بھی ذکر ہے کہ پائنٹ تھری ناٹ تھری رائفل جو ہیڈ کانسٹیبل شنکر، چوبیسویں واہنی، پی اے سی سے چھینی گئی تھی، ان کے کالم کے ذریعے برآمد کر لی گئی ہے۔ آرمی ہیڈکوارٹر کی ڈائری سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مورخہ 22 مئی 87 کو امن عامہ کی بحالی کے لیے لی گئی تلاشی اور کی گئی گرفتاریاں فوج کی رہنمائی میں ہی ہوئی تھیں۔ 22 مئی 87 کی وار ڈائری میں فوجی

آپریشن کے وقت لگ بھگ ایک ہزار مکانوں کی تلاشی، 600 آدمیوں کی گرفتاری اور بندوق، رائفل، تلواریں اور ایسڈ وغیرہ کے برآمد ہونے کا ذکر ہے۔

یہاں میرٹھ کے اس وقت کے سینئر پولیس سپرنٹنڈنٹ جی ایل شرما کا سی آئی ڈی کے سامنے دیا گیا یہ بیان بھی قابل ذکر ہے:

> ''انھیں یہ نہیں معلوم کہ تلاشیوں کی مشترکہ مہم کس کے حکم پر چلی تھی لیکن یہ پتا چلا تھا کہ یہ کام فوج کے لوگوں نے طے کیا تھا.... آرمی ہیڈ کوارٹر میں اس بارے میں میٹنگیں ہوتی تھیں۔ آرمی والے ہی طے کرتے تھے کہ کہاں کہاں تلاشیاں ہونی ہیں۔... تلاشی کی ہدایتیں صرف زبانی طور پر میٹنگ میں دی جاتی تھیں۔ گرفتاری کے وقت گرفتار لوگوں کی فہرست فوجی افسران تیار کرتے تھے اور وہ اپنے ریکارڈ تیار کر کے آرمی ہیڈ کوارٹر نئی دہلی کو بھیجتے تھے۔ آرمی والے اپنے ریکارڈ میں یہ لکھتے تھے کہ کتنے لوگ پکڑے گئے، ان میں کتنے ہندو ہیں اور کتنے مسلمان۔''

ایک درجن سے زیادہ گواہوں نے سی آئی ڈی کے سامنے بیان دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ میجر پٹھانیا کے ہاتھ میں ایک لاؤڈ ہیلر تھا جس سے وہ لگاتار لوگوں کو گھروں سے باہر نکلنے کا حکم دے رہے تھے۔ لاؤڈ ہیلر سے ہی وہ تلاشیوں میں لگے پولیس اور فوجیوں کے لیے بھی آپریشنل ہدایات نشر کر رہے تھے۔ سی آر پی ایف کی مہیلا یونٹ کی کمانڈر نے اپنے بیان میں کہا کہ میجر پٹھانیا نے انھیں عورتوں کی تلاشی لینے کا حکم دیا تھا۔

کئی برس کے بعد جب طویل خط و کتابت اور کئی سطحوں پر ہوئی کوششوں کے نتیجے میں فوجی افسر اور جوان سی آئی ڈی کے سامنے بیان دینے کے لیے آئے تو وہ ان سارے دعووں سے پلٹ گئے جو خود انھوں نے فوج کے مختلف ہیڈ کوارٹروں کو بھیجی گئی اپنی رپورٹوں میں کیے تھے۔ میجر پٹھانیا نے یہ تو قبول کیا کہ اس کے پاس ایک لاؤڈ ہیلر تھا، جس پر وہ وقت بوقت اعلانات کر رہا تھا، لیکن اس نے اس بات سے انکار کیا کہ اس نے لاؤڈ ہیلر پر لوگوں کو گھروں سے نکلنے کے لیے کہا یا وہاں تعینات حفاظتی دستوں کو کوئی

آپریشنل کمانڈ دیے۔ اس نے اس بات سے بھی انکار کیا کہ فوج نے تلاشیوں اور گرفتاریوں میں حصہ لیا۔ اپنے ہی ذریعے کیے گئے اس دعوے کو بھی اس نے خارج کر دیا کہ پی اے سی کی لوٹی گئی رائفل فوجیوں کے ذریعے برآمد کی گئی تھی۔ حالانکہ اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا کہ اس نے وقت بوقت سینئر فوجی افسروں کو بھیجے گئے سٹریپ (سچویشن رپورٹ) اور وار ڈائری میں کیوں فوج کے ذریعے گرفتاریوں اور تلاشیوں کے دعوے کیے تھے اور کیسے 21 اگست کو لوٹی گئی پی اے سی کی رائفل فوجی افسروں کے ذریعے تھانہ سول لائنز میں جمع کی گئی۔

میجر پٹھانیا کے رخ میں یہ تبدیلی اچانک نہیں آئی ہوگی۔ سی آئی ڈی کے سامنے بیان دینے کے لیے پیش ہونے کے پہلے یقیناً اس نے اور دوسرے فوجی افسروں نے قانونی صلاح لی ہوگی اور انھیں یہ صلاح ملی ہوگی کہ سٹریپ اور وار ڈائری میں اپنی کارگزاریوں کو بیان کرنے والے ان کے دعوے قانون کے بارے میں بہت کم جانکاریاں رکھنے والے فوجی افسروں سے شاباشی اور تمغے تو دلا سکتے ہیں لیکن قانون کی نظروں میں پوری طرح سے غیر قانونی ہیں اور اگر ثابت ہو جائے تو عدالتیں انھیں سزا دے سکتی ہیں۔ ہاشم پورہ ہتیا کانڈ کی سنوائی کے دوران بار بار طلب کیے جانے کے باوجود میجر پٹھانیا عدالت میں حاضر نہیں ہوا۔ ہندوستان کے نظام عدلیہ کی بے بسی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اپنی تمام کوششوں کے باوجود استغاثہ میجر پٹھانیا کو عدالت میں حاضر نہیں کرا سکا۔

قانون کے ذریعے واضح خطِ تقسیم کھینچے جانے کے باوجود فوجی افسروں نے بڑھ چڑھ کر کیوں وہ رول ادا کرنا شروع کر دیا جو ان کے لیے متعین نہیں تھا اور کیوں میرٹھ کے شہری اور پولیس انتظامیہ نے اپنا رول محدود کرنا شروع کر دیا اور ان معاملوں میں فوجی افسروں کے سامنے ہتھیار ڈالنے شروع کر دیے جو پوری طرح ان کے دائرۂ اختیار میں آتے تھے، اسے سمجھنے کے لیے میرٹھ کے اس دور کی پولیس اور شہری انتظامیہ کے حوصلے

اور ہندوستانی افواج کی ذہنی بناوٹ کو سمجھنا بہت ضروری ہوگا۔ پہلے میرٹھ کے اس دور کی شہری اور پولیس انتظامیہ کی بات کریں۔

18 مئی 1987 کو میرٹھ میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے۔اس کے کچھ مہینے پہلے ہی فرقہ وارانہ فسادات کا ایک دور گزر چکا تھا اور میرٹھ کے پچھلے تجربے یہ بتاتے تھے کہ اب کچھ مہینوں یا برسوں کے لیے وہاں شانتی رہے گی۔ میرٹھ میں تعینات اس وقت کے سینئر پولیس سپرنٹنڈنٹ وی کے بی نائر سے، 22 مارچ 2011 کو کیرل واقع ان کے گاؤں میں رات میں دیر تک ان دنوں کے میرٹھ کے بارے میں بات چیت ہوئی اور مئی 1987 کے واقعات کو یاد کرتے ہوئے انھوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ ان کے تقرر کے کچھ مہینے پہلے ہوئے فسادات کے سبب انھیں اور ضلع مجسٹریٹ کو یہ یقین تھا کہ اب اگلے کچھ دنوں تک میرٹھ میں فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوں گے اور وہ لوگ شانتی کے ساتھ اپنا وقت گزار سکیں گے۔ میرٹھ شہر کی تاریخ بتاتی تھی ایک بار دنگے کی آگ میں جھلسنے کے بعد شہر کچھ دن سستاتا تھا۔ اتر پردیش کی سیاست اور انتظامی روایتوں کو جاننے والے لوگوں کو پتا ہے کہ کسی بھی ضلعے کے ضلع مجسٹریٹ اور پولیس کپتان کو ڈیڑھ دو سال سے زیادہ رہنے کا موقع استثنائی صورت میں ہی ملتا ہے۔ سال بیتتے بیتتے ہر افسر کی الٹی گنتی شروع ہو جاتی ہے۔ اس لیے نائر کا یہ سوچنا بہت فطری تھا۔ لیکن حالات نے ان کی ان امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

مجھے ابھی تک 19 مئی 1987 کی وہ صبح اچھی طرح یاد ہے جب میرٹھ سے ڈی آئی جی رینج نتھو لال کی ہیجان زدہ آواز ٹیلیفون پر سنائی دی تھی۔ صبح کے آٹھ بجے تھے اور عموماً اسی وقت میں ان کے فون کی امید کرتا تھا۔ اس وقت تک ان کے پاس رینج بھر کے ضلعوں سے پچھلے 24 گھنٹوں میں واقع ہونے والے جرائم کی اطلاعات پہنچ چکی ہوتی تھی اور وہ ان کی بنیاد پر الگ الگ ضلعوں کے پولیس سپرنٹنڈنٹوں سے ان کے ضلعوں کے بارے میں بات کرتے تھے۔ ہارڈ ٹاسک ماسٹر اور کئی بار بدزبانی کی حد تک کڑک،

نتھولال پولیس سپرنٹنڈنٹوں کے درمیان خاصے ناپسند کیے جاتے تھے اور کوئی بھی ان کے ٹیلیفون کا بہت خوشی سے انتظار نہیں کرتا تھا۔ اس دن ان کی آواز میں ہیجان بھرا ہوا تھا اور وہ جلدی جلدی جو کچھ بول رہے تھے اس سے یہ سمجھ میں آیا کہ پچھلی رات میرٹھ میں بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ تشدد کے واقعات ہوئے ہیں اور وہ دوسرے ضلعوں سے پولیس فورس منگوا رہے ہیں۔ انھوں نے مجھے پولیس افسروں اور کرمچاریوں کی جو فہرست پڑھ کر سنائی اس کے مطابق فورس بھیجنے کا مطلب تھا اپنا آدھا ضلع خالی کر دینا۔ میں نے ان سے بحث کرنے کی کوشش بھی کی کہ اگر میرٹھ میں کچھ ہو رہا ہے تو اس کا اثر غازی آباد پر بھی پڑے گا کیونکہ غازی آباد نہ صرف میرٹھ سے لگا ہوا ضلع تھا بلکہ کافی حد تک حساس بھی تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری دلیلوں کا کوئی اثر نہیں ہوگا اور یہی ہوا۔ نتھولال نے یہ کہتے ہوئے ٹیلیفون پٹخ دیا کہ تحریری حکم وائرلیس سے پہنچ رہا ہے اور میں فوراً فورس روانہ کرنا شروع کروں۔ اس کے بعد ہر آدھے ایک گھنٹے کے بعد انھوں نے فون کر کے یہ معلوم کرنا شروع کر دیا کہ کتنی فورس روانہ ہو چکی ہے۔ شام تک میرا آدھا ضلع خالی ہو چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرٹھ رینج کے دوسرے ضلعوں کا بھی یہی حال ہوگا لیکن چاروں طرف سے اکٹھی کی گئی اس فوج کا ہوا کیا؟ یہ جاننا بڑا دلچسپ ہوگا۔

میں دنگا شروع ہونے کے دو تین دن کے اندر ہی بھارت سرکار کے صوبائی وزیر داخلہ چدمبرم کو ایسکورٹ کر کے سٹی کنٹرول روم میرٹھ لے گیا اور وہاں میں نے پایا کہ اس کیمپس میں دوسرے ضلعوں سے آئے ہوئے پولیس والے بھٹک رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو پچھلے 24 گھنٹوں سے مناسب آرام کیے یا کھائے پیے بغیر ہی پڑے تھے اور کوئی انھیں ان کی ڈیوٹی بتانے والا نہیں تھا۔ ان میں سے کچھ غازی آباد سے بھی آئے تھے اور مجھے دیکھ کر اپنا دکھڑا سنانے میرے پاس آ گئے۔ وہاں افراتفری کا عالم یہ تھا کہ مرکز کے صوبائی وزیر داخلہ جب سینیئر افسروں سے گفتگو کرنے کے لیے ایک کمرے میں بند ہو گئے، اسی وقت کوتوالی کے برآمدوں میں ہڑدنگیوں کا گروہ دروازوں کھڑکیوں کو پیٹتا

ہوا ان کی تلاش میں چل پڑا۔ وہ اس اطلاع پر وہاں آئے تھے کہ مرکز کے صوبائی وزیر داخلہ وہاں آئے ہوئے ہیں اور ان کے سامنے ہنگامہ کر کے وہ اپنے عزیز واقربا کو چھڑانا چاہتے تھے جنھیں پولیس نے پچھلی رات دنگوں میں ملوث ہونے کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔ میں چونکہ باہر سے آیا ہوا افسر تھا اس لیے میٹنگ میں شریک نہ ہو کر کوتوالی کے ایک دوسرے کمرے میں چدمبرم کے ساتھ آئے ان کے نجی سٹاف کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ ہجوم کا شور غل سن کر جب میں باہر نکلا تو میں نے اس بے قابو بھیڑ کو کوتوالی کی پوری عمارت پر لگ بھگ قبضہ کیے ہوئے دیکھا۔ کوتوالی میں موجود میرٹھ اور باہر سے آئے ہوئے پولیس کرمی بے بس سے اس بھیڑ کو دیکھ رہے تھے۔ واضح تھا کہ مقامی پولیس کی رہنمائی پوری طرح سے ناکام ہو چکی تھی۔ اعلیٰ افسران صوبائی وزیر داخلہ کے ساتھ کمرے میں بند تھے اور مجھولے درجے کے افسر کوئی فیصلہ نہیں لے پا رہے تھے۔ میں نے اپنے ساتھ گئے غازی آباد کے پولیس کرمیوں کو للکارا اور ہم سب نے مل کر ڈنڈے پھٹکارتے ہوئے بھیڑ کو اس کیمپس سے باہر کھدیڑا۔ میں اس واقعہ کا ذکر صرف یہ واضح کرنے کے لیے کر رہا ہوں کہ دنگوں کے دوران میرٹھ کی شہری اور پولیس انتظامیہ کے حوصلے پوری طرح سے پست ہو چکے تھا اور وہ بروقت فیصلہ لینے کی استعداد پوری طرح کھو چکے تھے۔

یہی سبب تھا کہ فوجی افسران کے بڑبولے پن کو چھوڑ بھی دیں تو خود ہمیں میرٹھ میں تعینات سول اور پولیس افسروں کے بیانوں سے یہ اندازہ ہوگا کہ وہاں گرفتاریوں اور تلاشیوں کے سارے بڑے فیصلے فوجی افسران لے رہے تھے۔ میں کتاب کے آخری باب میں ان کا تجزیہ کروں گا۔ یہاں تو صرف سٹی کنٹرول روم کے ایک پیغام کا ذکر کرنا ہی کافی ہوگا جو ابہام کی پوری صورت حال کو اجاگر کرتا ہے۔ مورخہ 21 مئی 87 کے اس پیغام میں درج ہے کہ 13 بج کر 14 منٹ پر ہاشم پورہ ہندوستانی فوج کے سپرد کر دیا گیا ہے اور آپریشن شروع ہونے والا ہے۔ یہ پیغام قانون کی غلط سمجھ پر مبنی اور میرٹھ انتظامیہ کی ہراسانی کا عکاس ہے۔ اسی طرح کی ایک مثال 21 مئی 1987 کے روزنامے 'امر

اجالا' کے پہلے صفحے پر چھپی وہ خبر ہے جس کا عنوان تھا: ''میرٹھ کسی بھی لمحے فوج کے حوالے۔'' یقیناً اس خبر کا سرچشمہ کوئی اعلیٰ افسر رہا ہوگا۔ بدقسمتی سے اس سے کسی نے نہیں پوچھا کہ کون سے بھارتیہ قانون کے تحت میرٹھ کو فوج کے حوالے کیا جا سکتا ہے؟

❁ ❁ ❁

حواشی:

1. In any policy that is to be pursued in the Army or otherwise, the views of the Government of India and the policy they lay down must prevail.

حواشی:

1۔ سی آئی ڈی کے ذریعے عدالت میں داخل فرد جرم کا حصہ۔

2۔ سُرجن داس، کمیونل رائٹس اِن بنگال، 1905-1947

3۔ فائل–379، باکس نمبر 41، پولیس ڈپارٹمنٹ 1936، ماخذ: اتر پردیش اسٹیٹ آرکائیوز۔

4۔ اے ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ، حصہ چار۔ ناشر: پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی ر ہندوستان میں رینیساں پبلشنگ ہاؤس، دہلی 110051 سے شائع شدہ۔

5۔ 'امر اُجالا، میرٹھ، 21 مئی 1987 میں چھپی خبر'' محسنہ اور ویر بہادر میں تو تو میں میں۔''

6۔ شکنتلا کوشک کی ہاتھ سے لکھی ڈائری کے حصے جو انھوں نے مصنف کو انٹرویو دیتے وقت سونپی تھی۔

8

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا

مجھے شروع سے یہ سوال متھتا رہا ہے کہ کیوں کر ہوا ہوگا ہاشم پورہ؟ اگر آپ ذہنی مریض نہیں ہیں تو کیسے کسی زندہ آدمی کے سینے پر بندوق رکھ کر اس کا گھوڑا دبا سکتے ہیں؟ انسان کا قتل کرنے کے لیے سب سے ضروری شرط ہے کہ آپ کے پاس اس کے لیے کوئی بہت مضبوط سبب ہو۔ مرنے والے نے آپ کے ساتھ کچھ ایسا کیا ہو کہ آپ غصے سے بلبلا رہے ہوں یا اسے قتل کرنے سے آپ کو کوئی بڑا مالی فائدہ یا باطنی سکون ملنے والا ہو، تبھی آپ اسے ماریں گے۔ ہاشم پورہ میں تو پہلی نظر میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ جنھیں مارا گیا تھا اور جنھوں نے مارا تھا وہ سب ایک دوسرے سے پہلی بار مل رہے تھے، ان کی آپس میں کوئی دوستی دشمنی نہیں تھی اور نہ ہی قاتلوں کو اپنے کارنامے کے بعد کوئی انعام ملنے کا ہی امکان تھا۔ 22-23 مئی کی اس اندھیری رات سے، جب میں مکن پور میں ہنڈن نہر کے کنارے مرنے والوں میں زندگی کے نشان تلاش رہا تھا اور لاشوں کے بیچ پہلا زندہ آدمی باب الدین ملا تھا، مجھے یہی سوال پریشان کرتا رہا ہے۔ کیسے مار پائے ہوں گے سب انسپکٹر سریندر پال سنگھ اور اس کی ٹکڑی کے دوسرے لوگ ان 42 مسلمان نوجوانوں کو جن سے کسی کی ذاتی دشمنی تو دور، اس کے پہلے انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں تھا؟

22 مئی 1987 کی اس امس بھری دوپہری میں ہاشم پورہ کے چھ سات سو لوگوں کو فوج، سی آر پی ایف، پی اے سی اور پولیس کے لوگ گھروں سے نکال کر گلمرگ ٹاکیز کے سامنے والی سڑک پر لے آئے اور فٹ پاتھ کی پٹریوں پر چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بیٹھے لوگوں میں سے کچھ کو ہی ٹرک نمبر URU-1493 پر بیٹھنے کے قابل سمجھا گیا تھا۔ اسی پر لاد کر انھیں مقتل لے جایا گیا تھا۔ قتل کے لیے چنے جانے کی واحد بنیاد ان کی عمر اور تندرستی تھی۔ وہ سبھی نوجوان اور ہٹے کٹے تھے۔ کئی بار تو ایسا ہوا کہ کوئی ایک اس ٹرک کی طرف ہریایا گیا اور تبھی قاتلوں میں سے کسی کو لگا کہ بندہ بوڑھا یا بیمار ہے تو اسے دوسری طرف کھدیڑ دیا گیا۔ لگ بھگ ویسے ہی جیسے قصائی کسی بیل کو خریدنے سے پہلے اس کی کانکھ میں انگلی کونچ کونچ کر مطمئن ہونا چاہتا ہے کہ جانور اس کے مطلب کا ہے یا نہیں، قاتلوں نے اس دوپہر ہاشم پورہ میں اپنے شکار بھی سوچ سمجھ کر چھانٹے۔ قتل کے لیے چنے گئے صحت مند نوجوان فطری طور پر اپنے فرقے کی طاقت تھے، انھیں مار کر 'بے رحم' مسلمانوں کو اجتماعی سبق سکھایا جا سکتا تھا۔

مرنے والوں کی نشان دہی کرنے کا کام جنھوں نے کیا وہ مارنے والوں سے مختلف تھے۔ برسوں کی بیزار کن اور غیر پیشہ ورانہ تفتیش کے بعد بھی سی آئی ڈی ان لوگوں تک نہیں پہنچ سکی جنھوں نے 21 مئی 1987 کی صبح ہوئی پربھات کے قتل اور اس سے پہلے پی اے سی کے جوان سے رائفل لوٹنے جیسے جرم کے لیے ہاشم پورہ کے مسلمانوں کو سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس نے عدالت کے سامنے صرف 19 لوگوں کو پیش کیا جن کی، فردِ جرم کے مطابق، ''دوشت مانسکتا'' یعنی آلودہ ذہنیت[1] ہی اس گھناونے ہتیا کانڈ کی ذمہ دار تھی۔ کئی جگہ 21 اور 22 مئی کو میرٹھ میں ہوئی ان پراسرار بیٹھکوں کا ذکر آیا ہے، جن میں میرٹھ کے تمام اعلیٰ سول اور پولیس افسر شریک تھے اور جن میں بڑھ چڑھ کر فوجی افسروں نے بھی حصہ لیا تھا۔ ان بیٹھکوں میں ہی ان لوگوں کا انتخاب کیا گیا تھا جنھیں قاتلوں کا رول نبھانا تھا اور وہ بھی چنے گئے تھے جنھیں شکاروں کی نشان دہی کرنا تھا۔

ہاشم پورہ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستانی معاشرے کی اس ذہنیت کو سمجھا جائے جو فرقہ وارانہ تشدد کے پیچھے کام کرتی ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ تشدد جسمانی ہی ہو۔ سماجی رشتوں میں تشدد کئی بار انسانی رویوں کی اتنی باریک پرتوں میں چھپا ہوتا ہے کہ اوپر سے سب کچھ نارمل لگتے ہوئے بھی اندر سے آپ کو چھیل سکتا ہے۔ جاتیوں اور دھرموں میں بٹے بھارتیہ سماج میں یہ تشدد کھان پان کی چھوا چھوت، آپسی بے اعتباری اور زبان کی سطح پر ہماری روزمرہ کی زندگی میں دکھائی دیتا رہتا ہے۔ 1987 کے دوران میرٹھ میں کئی مرحلوں میں ہونے والی مارکاٹ، جس میں کئی سو لوگوں کو اپنی جانیں گنوانی پڑی تھیں، اندر چھپی اسی نفرت کے وقت بوقت ہونے والے ٹھوس اظہار کی صورت میں پھوٹنے کی ایک مثال ہے۔ یہ دیکھنا دلچسپ ہوگا کہ دنگوں کو لے کر ایک اوسط ہندو یا ایک اوسط مسلمان کیسے سوچتا ہے؟ اس کتاب پر کام کرتے وقت میں نے اکثر ایک وقت میں کسی ایک علاقے میں ہوئی ایک ہی واردات کے بارے دونوں فرقوں کے لوگوں سے باتیں کی ہیں اور یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا کہ دونوں کے بیان ماجرا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کئی بار تو دونوں طرف کے 'آنکھوں دیکھے حالات' اتنے متضاد ہوتے ہیں کہ ان کے بیانوں میں سے سچ کو تلاش کر لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ میرٹھ کے انھی دنگوں کی مقامی ہندی اور اردو کے اخباروں میں رپورٹنگ اتنی مختلف تھی کہ کئی بار ایک ہی حادثے کا بیان دونوں میں پڑھتے وقت آپ کو لگ سکتا ہے کہ آپ دو الگ وارداتوں کے بارے میں پڑھ رہے ہیں۔ اس پس منظر میں ہاشم پورہ کا سچ جاننے کے لیے سمجھنا مفید ہوگا کہ اکثریتی سماج دنگوں کو لے کر کس طرح سوچتا ہے۔

اوسط ہندو یہ مان کر چلتا ہے کہ دنگوں کی شروعات مسلمان کرتے ہیں اور ان میں مرنے والوں میں زیادہ ہندو ہوتے ہیں۔ دنگوں کی شروعات کے بارے میں بحث کی گنجائش ہے لیکن مرنے والوں کی تعداد کے بارے میں تو قطعی نہیں۔ سرکاری اعداد شمار کے مطابق زیادہ تر دنگوں میں مرنے والوں میں نہ صرف مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوتی

ہے، بلکہ آدھے سے زیادہ میں تو یہ تعداد 90 فی صد سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ 1960 کے بعد ہمارے دیش میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوے ہیں، ان کی نوعیت سنہ 47 کے آس پاس ہوے بٹوارے سے متعلق فسادات سے مختلف ہے۔ تب تک بٹوارے سے پیدا شدہ اسباب لگ بھگ ختم ہو چکے تھے اور اس وقت کے مشرقی پاکستان سے بھاگ کر آنے والے ہندوؤں کے منھ سے سنی ہوئی زیادتیوں کے ردعمل میں ہونے والے کچھ دنگوں کو چھوڑ دیں تو ہم پائیں گے کہ زیادہ تر دنگوں کے اسباب بٹوارے کی یادوں سے ایک دم پرے ہٹ کر تھے۔ ان میں سے زیادہ تر فساد بٹوارے کے فوراً بعد کمزور پڑی مسلم اور ہندو فرقہ پرست تنظیموں کے پھر سے منظم ہونے اور سیاسی مفادات کے لیے دنگے کرانے کی بڑھتے رجحان کے کارن ہی ہوے۔ سرکاری آنکڑوں کے مطابق برباد ہونے والے مال و اسباب میں بھی لگ بھگ 75 فی صد مسلمانوں کا ہی ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ کوئی خفیہ حقائق ہیں لیکن اس کے باوجود تعصب اتنا گہرا بیٹھا ہے کہ برعکس حقائق سامنے رکھنے پر بھی اوسط ہندو ذہن یہ ماننے سے انکار کر دے گا کہ دنگوں کے لیے ہمیشہ مسلمانوں کو ہی مجرم نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

ہندوستانی پولیس کا اوسط عملہ اسی اکثریتی سماج سے آتا ہے اور فورس کا حصہ بنتے وقت اس کی عمر عام طور سے 18 سے 25 برس کے بیچ ہوتی ہے۔ اس عمر تک ہندو مسلم رشتوں کو لے کر اس کی سمجھ پختہ ہو چکی ہوتی ہے اور اپنے سماج کی طرح اس کا ماننا بھی یہی ہوتا ہے کہ دنگے مسلمانوں کی بدمعاشی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ ایک بار روگ کا 'کارن' پتا چل جانے کے بعد اس کا 'علاج' تلاشنا بھی مشکل نہیں ہے۔ اگر دنگوں کے پیچھے مسلمان ہیں تو انھیں روکنے کے لیے ان کے ہی خلاف کارروائی بھی کرنی پڑے گی۔ یہ نقطۂ نظر اتنا مضبوط ہے کہ ان دنگوں سمیت جن میں نقصان اٹھانے والوں میں بیشتر مسلمان ہوتے ہیں، لگ بھگ سبھی میں پولیس کی کارروائی کا ٹھیکرا مسلمانوں کے سر ہی پھوٹتا ہے۔ گرفتار لوگوں میں بیشتر وہی ہوتے ہیں، زیادہ تر انھی کے گھروں کی

تلاشیاں ہوتی ہیں، یہاں تک کہ پولیس کی گولیاں بھی انھی کو شکار بناتی ہیں۔ جن لوگوں کو دنگوں کے دوران کنٹرول روم میں پولیس افسروں اور مجسٹریٹوں کی بیٹھکوں میں شرکت کا موقع ملا ہوگا، ان کا دھیان میری طرح 'ہم' اور 'وہ' الفاظ پر ضرور گیا ہوگا۔ عام طور سے وہاں موجود افسر ہندوؤں کے لیے 'ہم' اور مسلمانوں کے لیے 'وہ' کا استعمال کرتے ہیں۔ 'ہم' اور 'وہ' کا فرق کرفیو کے دوران بھی دکھائی پڑتا ہے۔ اگر آپ کسی کرفیو زدہ شہر سے گزر رہے ہوں اور کسی علاقے میں شاہراہوں سے ہٹ کر گلیوں میں بچے کرکٹ کھیلتے نظر آئیں تو مان لیجیے کہ یہ ہندوؤں کی آبادی والا علاقہ ہے اور اس کے برعکس اس سے لگے مسلم علاقوں میں سختی سے نافذ کیا ہوا کرفیو دیکھ سکتے ہیں۔

یہ بہت غیر فطری نہیں ہے کہ بھارت میں فرقہ وارانہ دنگے اکثر ہندو بنام مسلمان کے بجائے پولیس بنام مسلمان میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ تشدد کے دوران اکا دکا پولیس والے مسلم محلے میں جاتے ہوئے اپنے آپ کو اسی طرح غیر محفوظ محسوس کرتے ہیں جس طرح اوسط ہندو۔ اس کے برعکس ہندو محلوں میں عموماً ان کا سواگت ہوتا ہے۔ آپ ایک عام منظر کے روپ میں ہندوؤں کو دنگوں کے دوران گھنٹوں ڈیوٹی پر کھڑے تھکے ماندے، بھوکے پیاسے پولیس کرمیوں کے لیے بھوجن اور آرام کا انتظام کرتے دیکھ سکتے ہیں۔

ہاشم پورہ ہونے کے کچھ ہی برس بعد، ایک فیلوشپ کے تحت، میں 'فرقہ وارانہ دنگوں کے دوران پولیس کی امیج' کے موضوع پر تحقیق کر رہا تھا تو میرے لیے یہ بڑے تجسس کا موضوع تھا کہ فسادات کے متاثرین میں بانٹے گئے سوال نامے کے ایک سوال کا جواب دونوں فرقوں نے ایک دم برعکس دیا تھا۔ یہ پوچھے جانے پر کہ فرقہ وارانہ دنگوں کے دوران وہ پولیس کو دوست یا دشمن کس روپ میں پاتے ہیں، زیادہ تر ہندوؤں نے دوست والے متبادل پر نشان لگایا، جبکہ اس کے برعکس لگ بھگ سبھی مسلمان دنگوں کے دوران پولیس کو دشمن کے روپ میں دیکھتے تھے۔ اس سوال کے جواب میں، کہ دنگوں کے دوران جب ان کا جان و مال خطرے میں ہو کیا وہ پولیس کے پاس حفاظت کے لیے جانا

چاہیں گے، سبھی ہندوؤں کے جواب اثبات میں تھے جبکہ بیشتر مسلمانوں نے نفی میں جواب دیا۔ پولیس کی یہ امیج دونوں فرقوں کے دلوں میں اپنے اپنے زمینی تجربوں کی بنیاد پر بنی تھی۔

میرا تجربہ یہ کہتا تھا کہ نارمل حالات میں ہندو بھی پولیس کو اپنا دوست نہیں کہیں گے۔ ایک کہاوت لگ بھگ سبھی بھارتیہ بھاشاؤں میں مروج ہے جس کے مطابق پولیس کی دوستی اور دشمنی دونوں بری ہیں۔ پھر کیونکر دنگوں کے دوران ایک اوسط ہندو پولیس کو اپنے محافظ اور دوست کے روپ میں دیکھتا ہے؟ ممکنہ طور پر اس کے پیچھے ایک ہی وجہ ہے کہ اوسط پولیس کرمی خاکی کپڑوں کے نیچے بھی اپنی ہندو پہچان بنائے رکھتا ہے۔ اسے بھی کہیں نہ کہیں یہ لگتا ہے کہ اگر وہ مداخلت نہیں کرے گا تو 'بربر' مسلمان 'امن پسند' ہندوؤں کا جینا محال کر دیں گے۔

اکثریتی ہندوؤں کے دل میں گہرے پیٹھے اس تصور کو کہ دنگے عام طور سے مسلمان شروع کرتے ہیں، اگر آپ اس حقیقت سے چنوتی دینے کی کوشش کریں کہ آزادی کے بعد کے لگ بھگ ہر دنگے میں زیادہ تر مرنے والے مسلمان ہیں اور یہ کوئی چھپا ہوا راز نہیں ہے، پھر کیوں وہ دنگے شروع کرتے ہیں تو آپ کو ایک بہت دلچسپ جواب سننے کو ملے گا۔ اوسط ہندو یہ کہے گا کہ 'مزاج سے بے رحم اور بربر' مسلمان دنگا شروع تو کر دیتا ہے اور 'امن پسند' اور 'نرم دل' ہندو شروع میں نقصان اٹھاتا ہے لیکن پولیس کے موقعے پر پہنچتے ہی صورت حال بدل جاتی ہے۔ 'دوست' پولیس نہ صرف ہندوؤں کی حفاظت کرتی ہے بلکہ 'دشٹ' مسلمانوں کو سزا بھی دیتی ہے اور مسلمانوں کا زیادہ نقصان اسی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر پولیس نہ ہو تو 'اپنے ہی دیش' میں ہندوؤں کا رہنا مشکل ہو جائے۔ 1987 کا میرٹھ بھی 'منی پاکستان' بن گیا تھا اور اگر پی اے سی نے سبق نہ سکھایا ہوتا تو مسلمان ہندوؤں کا جینا دوبھر کر دیتے۔ دنگوں کے دوران چھپی دو رپورٹیں اس ذہنیت کو اچھی طرح واضح کر دیتی ہیں۔

28 مئی کو 'امر اُجالا' کا تبصرہ تھا کہ "پی اے سی کو ہٹانا میرٹھ کو بربادی کے کگار پر بٹھانا ہوگا۔" دوسرے دن 29 مئی کو 'دینک جاگرن' نے لکھا، "سمے پر پی اے سی نہ آتی تو تباہ ہو جاتے۔" اسی تصور کے تحت ہندو، فرقہ وارانہ تشدد کے دوران پولیس کو اپنا دوست پاتا ہے۔ ایسی ہی صورت حال میں مسلمان اسے اپنا دشمن کیوں سمجھتا ہے؟ 1860 کی دہائی میں بننے والے مختلف قانونوں کے تحت ایک جدید ادارے کے روپ میں منظم کی گئی پولیس ایسا کیا کرتی ہے کہ فرقہ وارانہ تشدد کے دوران اس کی امیج کسیغیر جانب دار امپائر کی نہیں بن پاتی؟ یہ جاننے سے زیادہ ضروری اس بات کی پڑتال ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟ ہاشم پورہ کی گتھی سلجھانے کے لیے ہمیں ان سوالوں کا جواب تلاشنا ہوگا اور اس ذہنیت کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرنی ہوگی جس کے تحت خاکی وردی پہنے انیس پولیس والے بیالیس اجنبی نوجوانوں کے سینوں سے سٹا کر اپنی بندوقوں کے ٹرائیگر صرف اس لیے دبا دیتے ہیں کہ مرنے والے صحت مند تھے، نوجوان تھے اور مسلمان تھے۔

دونوں فرقوں کی ایک دوسرے سے متعلق یہ سمجھ کئی صدیوں تک ساتھ رہنے کے دوران حاصل تجربات کی اپج ہے اور کسی بھی ماہر سماجیات کے لیے ایک دلچسپ مطالعے کا موضوع ہوسکتی ہے۔ یہاں تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے لیکن بھارتیہ سماج کو سمجھنے کی کوشش کرنے والے ایک متجسس شخص کی حیثیت سے میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ دونوں فرقوں کی سمجھ ایک دوسرے کے بارے میں بہت ہی گہرے پیٹھے تعصبات پر مبنی ہے۔

بھارتیہ سماج کا ڈھانچہ ایک پیچیدہ کیمسٹری کے ارتباط کا نتیجہ ہے۔ کئی سو برس سے ساتھ رہنے والے دو بڑے مذہبی فرقوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپسی تعلقات کے باریک ریشوں کو پکڑ پانا کسی سنجیدہ ماہر سماجیات کے لیے بھی کسی بڑی چنوتی سے کم نہیں ہے۔ صدیوں تک ساتھ ساتھ رہنے کے دوران دونوں کے بیچ شاندار لین دین ہوا ہے۔ اس لین دین کا نتیجہ ہم ان فنی بلندیوں میں دیکھ سکتے ہیں جو ان کے ارتباط سے وجود میں آنے والی مصوری، عمارت سازی اور مجسمہ سازی جیسے بصری فنون اور رقص، ناٹک اور

سنگیت جیسے اسٹیج کے فنون میں مضمر ہے۔

لیکن یہ کہنا کہ ان کا ساتھ صرف رواداری اور ہم آہنگی پر مبنی تھا، سچ کو جھٹلانا ہوگا۔ ہندوستان کے بے شمار گانووں اور شہروں میں ساتھ ساتھ رہنے والے ان دونوں دھرموں کے ماننے والوں کے تعلقات ہمیشہ پرامن رہے ہوں، ایسا نہیں تھا۔ دونوں کے بیچ آپسی لڑائی جھگڑوں کی بھی لمبی تاریخ رہی ہے۔ حالانکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزوں کے ہندوستان پر قبضے سے پہلے ہمیں ایسی مثالیں کم ملیں گی جن میں عام ہندو اور مسلمان باشندے آپس میں لڑے ہوں۔ زیادہ تر سنگھرش ہندو اور مسلمان راجاؤں کے بیچ ہوتے تھے۔ سبب بھی اکثر مذہبی کم، سیاسی زیادہ ہوتے تھے اور ان جنگوں میں اس اہم حقیقت کو بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے کہ عام طور سے ایک دوسرے سے لڑنے والی فوجوں میں دونوں طرف ہندو اور مسلمان ہوتے تھے۔ ہندو تشخص کے عہد وسطیٰ کی علامات بن چکے رانا پرتاپ اور شواجی اس کی سب سے بڑی مثالیں ہیں۔ دونوں کے خلاف لڑنے والی فوجوں کی کمان راجپوت سپہ سالاروں کے ہاتھوں میں تھی اور ان دونوں فوجوں کے مرکزی رول میں مسلم سپہ سالار تھے۔

برصغیر ہندوستان میں مضبوط برٹش حکومت قائم ہو جانے کے بعد ہی ہمیں ہندو مسلم پرجا کے بیچ مسلسل، متشدد جھڑپوں کی مثالیں ملنی شروع ہوتی ہیں اور لگاتار اس کے ثبوت بھی ملتے ہیں کہ برٹش حکومت نہ صرف ان جھڑپوں کی حوصلہ افزائی کرتی تھی بلکہ اپنے وجود کے لیے مفید 'پھوٹ ڈالو اور راج کرو' کی پالیسی کی کامیابی کے لیے ایک لازمی اوزار کی طرح استعمال بھی کرتی تھی۔ فرقہ وارانہ تشدد کے دوران پولیس سمیت راجیہ کے دوسرے اداروں کے جانبدارانہ رویے کی مثالیں انگریزی حکومت کے زمانے میں وافر تعداد میں فراہم ہیں۔ اس دور میں شہری انتظامیہ، فوج یا پولیس میں اعلیٰ عہدوں پر یوروپی لوگ ہوتے تھے لیکن ان کے ماتحت جو لاکھوں کرمچاری مقرر تھے، اُن میں بیشتر ہندو یا مسلمان ہندوستانی تھے۔ عام لوگوں سے اپنے روزمرہ کے سلوک میں یہ سرکاری

نوکرانھی اقدار میں یقین رکھتے تھے جنھیں انھوں نے اس وقت کے بھارتیہ سماج سے اخذ کیا تھا اور یہی اقداران کے روزمرہ کے رویوں کی بنیاد ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ ایک سرکاری ملازم اپنے ہم پلہ ساتھیوں کے ساتھ معاملات میں ذات پات اور دھرم پر مبنی چھوا چھوت، بے اعتباری یا تعصبات سے آزاد نہیں ہوتا تھا۔ ان رویوں کے سبب یہ بہت فطری ہی تھا کہ ایک نئے بننے والے اور کافی حد تک سیکولر حکومتی نظام میں اس کے کرمچاری اپنے اپنے دھرموں کی پیروکار عوام کے تئیں زیادہ جواب دہ محسوس کرتے تھے اور پرجا کی توقعات بھی ان سے مختلف ہوتی تھیں۔ ہاشم پورہ کو سمجھنے کے لیے ہمیں خاص طور سے پولیس سے کی جانے والی توقعات کو سمجھنا ہوگا۔

بھارتیہ سماج پولیس سے ایک خاص طرح کی فرقہ پرستی کی توقع کرتا رہا ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں اپنے اپنے فرقے کے پولیس کرمیوں کو اپنے محافظ کے روپ میں دیکھتے ہیں اور دوسرے فرقے کا پولیس کرمی ان کے دلوں میں اعتبار کا رشتہ پیدا نہیں کر پاتا۔ شاید یہ لمبے تاریخی تجربوں کی اپج ہے۔ ان کے سبب ساتھ ساتھ رہتے ہوئے بھی دونوں ایک دوسرے کے تئیں بے اعتباری سے معمور رہتے ہیں۔ یہاں بہت تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے لیکن میں صرف دو دستاویزوں کا ذکر کرنا چاہوں گا، جو ہندو مسلم دنگوں کے دوران پولیس کے رول پر تحقیق کرتے وقت میرے ہاتھ لگے تھے اور جن سے یہ سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ کس طرح، آزادی سے پہلے، ایک اوسط ہندو یا مسلمان پولیس کرمی اپنے فرقے کے مفادات کے محافظ کے روپ میں دیکھا جاتا رہا ہے۔ ان دستاویزوں سے ہمیں یہ بھی سمجھنے میں مدد ملے گی کہ کیسے فرقہ وارانہ تصادم کے دوران پولیس تھانے پر جانے والا متاثرہ ہندو یا مسلمان اپنے ہم مذہب پولیس کرمی کے ساتھ زیادہ سہجتا سے مکالمہ قائم کر لیتا ہے یا کیوں اسے دوسرے دھرم کے پولیس کرمی کی ہر حرکت ناقابل اعتبار اور معاندانہ لگتی ہے۔ بدقسمتی سے آزاد ہندوستان میں بھی حالات بہت نہیں بدلے ہیں۔

پہلی مثال کے روپ میں میں بیسویں صدی کے ابتدائی دہائیوں میں ہونے والے مشرقی بنگال کے پرتشدد واقعات کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ بنیادی طور پر یہ دنگے ہندو زمینداروں اور سودخور مہاجنوں کی زیادتیوں کے خلاف غریب مسلمان کسانوں کی بغاوت کا اظہار تھے لیکن جلدی ہی ان کی لیڈرشپ کٹرپنتھی ملاؤں کے ہاتھ میں آگئی۔ اس دور کے کئی دستاویز میرے ہاتھ لگے جن میں یہ جھوٹا دعویٰ کیا گیا تھا کہ ڈھاکہ کے نواب اور برطانیہ کی مہارانی کے بیچ ایک سمجھوتہ ہوا ہے کہ ایک معینہ مدت کے دوران ہندوؤں پر کیے گئے حملوں کے لیے کسی بھی مسلمان کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں چلایا جائے گا۔ دستاویزوں کے مطابق مذکورہ افواہوں کو پھیلانے اور ان کے مستند ہونے کی چھاپ بھولے بھالے دیہاتیوں کے من میں بٹھانے کا کام مسلم پولیس کرمیوں نے کیا تھا۔ ایک مقدمے کے دوران ایک دیہی مسلمان نے، جس پر ہندوؤں کے خلاف تشدد میں حصہ لینے کا الزام لگایا جا رہا تھا، بڑی معصومیت سے عدالت میں موجود ایک سپاہی کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا کہ اسی نے بتایا تھا ہندوؤں پر اس مدت کے دوران کیا گیا حملہ راج بھکتی کا کام مانا جائے گا اور برٹش مہارانی اور ڈھاکہ کے نواب کے بیچ ہوئے سمجھوتے کے مطابق اس کام کے لیے عام معافی ملی ہوئی ہے۔[2]

الٰہ آباد سے شائع ہونے والے روزنامے 'لیڈر' کے مدیر سی وائی چنتامنی کی یونائیٹڈ پرووِنس (آج کا اتر پردیش) کے پرنسپل سکریٹری بومفورڈ کے ساتھ 1936 میں ہوئی خط و کتابت بہت دلچسپ ہے جس میں انھوں نے کانپور کے ایک امیر شہری پنڈت رگھوبیر دیال بھٹ ویدیہ کی اس فکر کی جانب سرکار کا دھیان دلانے کی کوشش کی ہے کہ کانپور کے تھانوں میں ہندوؤں کے مقابلے زیادہ مسلمانوں کے تقرر سے کانپور کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی خطرے میں پڑ گئی ہے اور وہاں کے ہندو خود کو غیر محفوظ محسوس کر رہے ہیں۔[3]

مذکورہ دونوں مثالیں ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہیں کہ کس طرح بھارتیہ سماج اپنی

پولیس سے فرقہ وارانہ توقعات رکھتا رہا ہے۔ ہاشم پورہ پر کتاب لکھنے کی تیاری کے دوران میں نے الگ الگ سطحوں کے پولیس افسروں اور کرمچاریوں سے تفصیلی گفتگو کی اور اُس نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے 1987 میں ہاشم پورہ اور ملیانہ جیسے دو بد بختانہ وارداتیں ہوئی تھیں۔ اس دوران میرٹھ میں تعینات بیشتر پولیس کرمی یہ مانتے تھے کہ دنگا مسلمانوں کی شرارت سے ہو رہا ہے۔ وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ مسلمانوں کے حوصلے بڑھ جانے سے میرٹھ منی پاکستان بن گیا ہے اور یہاں مستقل امن قائم کرنے کے لیے مسلمانوں کو سبق سکھانا ضروری ہے۔ یہ سوچ صرف نچلی سطح کے پولیس کرمیوں کی ہی نہیں تھی بلکہ اعلیٰ عہدوں پر بیٹھے سول اور پولیس افسر بھی یہی سوچتے تھے۔ اسی لیے اگر لکھنؤ میں بیٹھے اعلیٰ افسران یا وزیراعلیٰ یہ حکم دیتے کہ بلوائیوں کے ساتھ سختی کے ساتھ نمٹا جائے تو میرٹھ میں تعینات افسر اس کے یہ معنی نکالتے کہ مسلمانوں کے ساتھ سختی کی جائے۔ تلاشیوں اور گرفتاریوں کے لیے جاری احکامات کا مقصد مسلمانوں کے گھروں کی تلاشیاں یا مسلمانوں کی گرفتاریاں ہوتی تھیں۔

پولیس کے اعلیٰ عہدیدار پی اے سی کی اس ٹکڑی کی کرتوتوں کو لے کر کتنے سنجیدہ تھے جس نے ہاشم پورہ کے مسلمانوں کو مارا تھا، اس کا اندازہ تو صرف اس حقیقت سے لگ جاتا ہے کہ مجرموں کو معطل کرنے میں ہی اس نے برسوں لگا دیے اور کچھ ہی دنوں میں انھیں پھر سے بحال کر دیا گیا۔ پولیس ڈائرکٹر جنرل، سی آئی ڈی اور پی اے سی کے ہیڈ کوارٹروں میں بیٹھے اعلیٰ افسروں کی باہمی خط و کتابت اس بات کے ثبوت ہیں کہ ہر سطح پر مجرموں کو معطل کرنے کا فیصلہ ٹالنے کی پوری کوشش کی گئی تھی۔

فرقہ پرستی اور اس کے ٹھوس اظہار، یعنی فرقہ وارانہ تشدد کو ہمیشہ جواز کی تلاش رہتی ہے۔ جواز پانے کے لیے یہ فرقہ تاریخ اور دیومالا کا سہارا لے کر ایسے بیانیے بُنتا ہے جن سے خود کو اور دوسروں کو یہ یقین دلایا جا سکے کہ وہ ایک امن پسند فرقہ ہے اور اس کے برعکس اس کا مقابل فرقہ اپنی داخلی بناوٹ میں ہی بے رحم اور متشدد ہے۔ ہر بار کے فرقہ

وارانہ تشدد کے لیے وہ اسی نیریٹو میں ایسے وجوہ تلاشتا ہے جن سے اپنے آپ کو اور دوسروں کو یہ یقین دلایا جا سکے کہ اس نے اپنے مخالف پر جو ہاتھ اٹھایا تھا، اس کے لیے اسے مجبور کیا گیا تھا۔

31 اکتوبر 1984 کو اندرا گاندھی کے قتل کے بعد سکھوں کے وسیع پیمانے پر قتل عام سے پہلے افواہ پھیلائی گئی کہ قتل کی خبر سن کر انھوں نے مٹھائیاں بانٹی ہیں۔ یہ افواہ کہیں بھی سچ نہیں پائی گئی۔ 1946 میں بہار میں تیس ہزار مسلمانوں (غیر سرکاری اندازہ چالیس سے پچاس ہزار) کے قتل عام کو نوا کھلی میں مسلمانوں کے ذریعے ہندوؤں کے قتل عام کا ردعمل بتایا گیا جبکہ نوا کھلی میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 139 (غیر سرکاری اندازہ 200) ہندو مارے گئے تھے۔

پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی کے ذریعے شائع شدہ 'اے ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ' حصہ چار میں شریف المجاہد کے مضمون 'کمیونل رائٹس'[۴۴] کے مطابق بھارت کے فرقہ وارانہ فسادات ہندوؤں کی سفاکی اور مسلمانوں کی امن پسندی کی مثال ہیں۔ اس مضمون کی مانیں تو ہندو مزاج سے ہی جھوٹا، مکار اور دغاباز ہوتا ہے جبکہ مسلمان مزاجاً ٹھیک اس کا الٹ ہے۔ مذکورہ بالا مثالیں میں نے یہ سمجھنے کے لیے دی ہیں کہ صرف فرقہ پرست طاقتیں ہی اپنے فرقے کو تشدد کے لیے بھڑکانے کی غرض سے دوسرے فرقے کی سفاکیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان نہیں کرتیں بلکہ نسبتاً روادار دانشور طبقہ بھی اپنے فرقے کے تشدد کو جائز ٹھہرانے کے لیے ایسے دلائل گڑھتا ہے۔ اکثریتی ہندو ذہن میں پیٹھا یہ تصور کہ مسلمان مزاجاً سفاک اور ہندو نرم دل ہوتے ہیں، خود ستائش کے اسی جذبے کی نشان دہی کرتا ہے جو اُن کے تشدد کو جواز فراہم کرتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ 1987 میں، غازی آباد میں ایک افواہ بڑے زور شور سے پھیلی تھی۔ پورا شہر یہ مانتا تھا کہ شاستری نگر میں، جو تب کے میرٹھ کا باہری حصہ تھا اور جہاں شہر کا متوسط طبقہ ایک منظم رہائشی کالونی بنا کر بستا تھا، رہنے والی ہندو عورتوں کی چھاتیاں کاٹی

گئی ہیں، ان کے گھروں میں لوٹ مار ہوئی ہے اور زیادہ تر ہندو وہاں سے بھاگ گئے ہیں۔ سچائی اس کے بالکل برعکس تھی۔ دنگوں کے دوران یہاں رہنے والے لگ بھگ سارے مسلمان گھرانے اپنے گھر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور زیادہ تر تو تشدد تھمنے کے بعد بھی واپس نہیں لوٹے اور اونے پونے داموں میں اپنے گھر بیچ کر واپس تنگ گلیوں والے انھی مسلم علاقوں میں چلے گئے جہاں سے کھلی ہوا، چوڑی سڑکوں اور پارکوں والی رہائشی کالونیوں میں رہنے کی چاہت انھیں شاستری نگر لے کر آئی تھی۔ ان میں اردو کے ایک شاعر بشیر بدر بھی تھے جو خانہ بدوش ہونے کے بعد کافی دنوں تک اپنے دوست گھنشیام سنگھ راجا کے گھر پر غازی آباد میں رہے۔ اس جلاوطنی کے دوران کئی بار ان سے لمبی بات چیت کا موقع ملا اور فرقہ پرستی سے وابستہ بھارتیہ سماج کے ایک اہم پہلو کو میں سمجھ سکا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ 1947 میں تقسیم ملک کے بعد مسلمانوں کے متوسط طبقے کا بڑا حصہ پاکستان چلا گیا تھا اور اس نقصان کی تلافی کرنے میں انھیں تین سے زیادہ دہائیاں لگ گئیں۔ 1970 کے بعد حالات بدلے اور شہری روزگار کے نئے موقعوں نے ایک بڑے مسلم متوسط طبقے کو پنپنے کے لیے موافق حالات پیدا کیے۔ اس نئے متوسط طبقے کے دل میں بھی زندگی کو لے کر وہی سپنے تھے جو عام طور سے کسی بھی متوسط طبقے کے ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک خواہش صاف ستھری بستیوں میں رہنے کی بھی تھی۔ ابھی تک مسلمان عام طور سے شہر کے پرانے حصوں میں تنگ گلیوں اور ناکافی شہری سہولیات والے محلوں میں رہتے چلے آئے تھے۔ آبادی بڑھنے کے ساتھ ان حصوں میں یہ سہولیات وقت گزرنے کے ساتھ کم ہی ہوئی ہیں۔ عدم تحفظ کے احساس اور بے اعتمادی کے ماحول کی وجہ سے چاہتے ہوئے بھی وہ اس دور میں تیزی کے ساتھ ترقی کر رہے شہروں کے نئے علاقوں کا حصہ نہیں بن پائے تھے۔ آٹھویں دہائی میں انھوں نے شہر کے پرانے علاقوں سے نکل کر ان نئی آبادیوں میں بسنا شروع کیا، شروع میں جھجکتے ہوئے اور خدشوں

کے ساتھ شاستری نگر بھی ایسا ہی ایک تجربہ تھا۔ بشیر بدر، جن کی تب ایک اہم اردو شاعر کے روپ میں پہچان بن رہی تھی، ان شروعاتی مسلمانوں میں سے تھے جنھوں نے شاستری نگر میں بسنے کا ارادہ کیا تھا۔ ان کے آگے پیچھے کئی مسلم پریواروں نے شاستری نگر میں چھوٹے بڑے پلاٹ خریدے اور اپنے سپنوں کے گھر بنائے۔ پرانے محلوں سے نکل کر آتے وقت ان کے دلوں میں جتنے خدشے تھے، ان سے زیادہ انھیں اپنے پڑوسیوں کے طعنے ستا رہے تھے۔ پڑوسیوں کے مطابق وہ جا تو رہے تھے لیکن جلد ہی انھیں 'اپنوں' کے بیچ واپس آنا پڑے گا۔ پڑوسی صحیح ثابت ہوے۔ 1987 کے دنگوں میں بشیر بدر کا گھر جلا دیا گیا، وہ صرف اس لیے بچ سکے کہ حملے کے وقت وہ وہاں نہیں تھے۔ ان کے علاوہ شاستری نگر کے دوسرے مسلمان باشندوں کا بھی تجربہ کم وبیش ایسا ہی تھا۔ ان میں سے زیادہ تر مسلم اکثریتی علاقوں میں واپس لوٹ گئے۔

میں نے بشیر بدر کے تجربے کو کچھ تفصیل کے ساتھ اس لیے لکھا ہے تا کہ ہم فرقہ وارانہ تشدد سے پہلے لازمی جواز کی خواہش کو سمجھ سکیں جس کے سبب شاستری نگر میں یک طرفہ مسلم مخالف تشدد کے باوجود وہاں سے ساٹھ کلومیٹر سے بھی کم دوری پر واقع غازی آباد کے ہندو بے بنیاد افواہوں کو صحیح مانتے رہے۔ میرٹھ میں تعینات پولیس کرمی بھی ان افواہوں سے بری طرح متاثر تھے۔ سی آئی ڈی کے سامنے ہاشم پورہ کے ایک مسلمان قیدی نے بیان دیا کہ ان کا ٹرک کے تھانہ سول لائنز پہنچنے پر وہاں موجود پولیس کرمیوں نے کہا تھا کہ ''چھاتی کاٹنے والے آ گئے۔'' باوجود اس کے کہ میرٹھ میں ایک بھی ایسا معاملہ کسی بھی تھانے میں درج نہیں ہوا تھا جس کے تحت کسی ہندو عورت کی چھاتی مسلمانوں نے کاٹی ہو، پولیس کرمی اس افواہ میں یقین کرتے تھے کہ مسلمان دنگوں میں چھاتیاں کاٹ رہے ہیں۔ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ دنگا مسلمانوں کی وجہ سے چل رہا ہے اور اسے روکنے کے لیے انھیں سبق سکھانا ضروری ہے۔ ہاشم پورہ درحقیقت سبق سکھانے کے اسی پروسس کا حصہ تھا۔

میں نے میرٹھ کے ان دنگوں اور ان سے بعد کے بہت سے دنگوں کے دوران تعینات پولیس افسروں اور مجسٹریٹوں سے بات کی ہے اور دنگوں سے نپٹنے کے لیے بنائے گئے کنٹرول روموں میں چلنے والی بیٹھکوں کی بھاشا کوڈی کنسٹرکٹ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے تشدد کو کچلنے کے لیے تعینات مختلف سطحوں کے پولیس کرمیوں کے رویوں کا مطالعہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ ہاشم پورہ کا ہیرو یا ویلین، سریندر پال سنگھ اتر پردیش پی اے سی کا سب انسپکٹر تھا اور واردات کے دوران پی اے سی کی اکتالیسویں بٹالین میں صوبیدار یا پلاٹون کمانڈر کے روپ میں تعینات تھا۔ اس میں ایسا کیا تھا کہ اس قتل عام کے لیے اسے چنا گیا؟ میں نے اوپر لکھا ہے کہ چونکہ سریندر پال سنگھ اب مر چکا ہے اس لیے میں اس سے ہوئی لمبی بات چیت کا استعمال اس کتاب میں بہت ضروری ہونے پر ہی کروں گا۔ اپنے سروس ریکارڈ اور اس میں ہر سال درج ہونے والے اندراج کے مطابق سریندر پال سنگھ ایک اچھی قد کاٹھی والا جوان تھا جو اپنے یونٹ کی مختلف سرگرمیوں میں جوش وخروش کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔ یکم اپریل 1946 کو جنما سریندر پال سنگھ 21 سال کی عمر میں کانسٹبل کے روپ میں بھرتی ہوا اور ترقی پاتے ہوئے 22 مئی 1982 کو سب انسپکٹر بنا تھا۔ اس کے سروس ریکارڈ کھنگالتے ہوئے میں خاص طور سے اس کے سب انسپکٹر بننے کی تاریخ پر ٹھٹکا۔ کیا عجیب اتفاق تھا کہ اس عہدے پر پہنچنے کے ٹھیک پانچ سال بعد اسی تاریخ کو وہ ہاشم پورہ کا سوتردھار بنا۔

سریندر پال سنگھ سے ہوئی کئی ملاقاتوں میں سے صرف ایک کا میں خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گا۔ یہ ایک نسبتاً لمبی ملاقات تھی جو بلا ارادہ، اتفاقاً ہی ہو گئی تھی۔ تاریخ تو نہیں یاد، لیکن سنہ 1999 کی ہلکی سردیوں کے دن تھے۔ آخر نومبر یا شروعاتی دسمبر رہا ہوگا، جب وہ ایک شام مجھے غازی آباد شہر کی 'نویگ مارکیٹ' میں نظر آ گیا۔ ان دنوں 'ورتمان ساہتیہ' وہیں سے چھپتا تھا اور میں ادارت کے سلسلے میں بیچ بیچ میں وہاں جاتا رہتا تھا۔ اس دن بھی اسی سلسلے میں وہاں سے گزر رہا تھا کہ میں نے اسے سڑک کے کنارے

کسی سے بات کرتے دیکھا۔ کار رکوا کر میں اس کی طرف لپکا تو مجھے دیکھ کر وہ تھوڑا چونکا ضرور لیکن میں اس کے سامنے پہنچ چکا تھا، اس لیے اب وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے دو تین بار ایسا ہوا تھا کہ وہ مجھے جھانسا دے کر نکل گیا تھا لیکن اس بار وہ بچ نہیں پایا۔ وہ جانتا تھا کہ میں اسے کیوں تلاشتا رہتا ہوں، اس لیے ہمیشہ بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ شاید اپنے کیے کو کسی ایسے آدمی کے سامنے دہرانے میں اسے بے چینی ہوتی ہوگی جو اس کے کرتوت کو اخلاقی حمایت نہ دیتا ہو۔ تھوڑی دقت ضرور ہوئی لیکن میں اسے 'ورتمان ساہتیہ' کے دفتر تک لانے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ ملاقات کئی معنوں میں اہم تھی۔ دس منٹ کی مجوزہ ملاقات لگ بھگ دو گھنٹے تک چلی۔ ابتدائی جھجک کے بعد جب وہ کھلا تو پھر زیادہ تر وہی بولتا رہا۔ پچھلی ملاقاتوں کی طرح میں باریکی سے اس کی شخصیت کا مطالعہ کرنے کی کوشش کرتا رہا اور ہر بار کی طرح اس کی آنکھوں کی چمک اور حرکات وسکنات سے مجھے لگا کہ اس میں کچھ تو ہے جو اسے دوسروں سے الگ کرتا ہے۔ اس کی بھاشا میں چھپا استحکام اور سوالوں کے جواب دیتے وقت ایک خاص طرح کا شاطر پن آپ کا دھیان کھینچ سکتے تھے۔ وہ کم پڑھا لکھا تھا اور اسے مربوط گفتگو میں بہت ماہر نہیں کہہ سکتے، لیکن فرقہ پرستی کے مسئلے پر اس کا نظریہ بڑا صاف تھا۔ اس کے اندر مسلمانوں کو لے کر جو زہر بھرا تھا اس کا ایک نمونہ ہم اوپر کانسٹبل ڈرائیور افتخار کے معاملے میں دیکھ چکے ہیں۔ میں نے اسے ٹوکا نہیں اور زیادہ تر وہی بولتا رہا۔

میں بار بار گھما پھرا کر یہ جاننا چاہتا تھا کہ کس کے حکم سے اس نے اتنا بڑا کانڈ کر ڈالا، یا کیسا لگا ہوگا اسے جب اس نے اتنے سارے لوگوں کو مارنے کا حکم اپنے ماتحتوں کو دیا تھا اور خاص طور سے اس لیے بھی کہ ان میں سے کسی سے بھی اس کی کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔

ہر ملاقات کی طرح اس بار بھی کبھی وہ سیدھے مدعے پر نہیں آیا اور اپنی پسندیدہ دلیل کو دہراتا رہا کہ میرٹھ منی پاکستان بن گیا ہے، مسلمانوں نے ہندوؤں کا جینا محال کر رکھا

ہے اور دنگوں پر قابو کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ انھیں ایسی سزا دی جائے کہ وہ مستقبل میں دنگا کرنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

یہ ضرور تھا کہ روانی سے مسلسل بولتے وقت بھی وہ اتنا لاپروا نہیں تھا کہ میرے اس بجھاؤ کو قبول کر لیتا کہ ہاشم پورہ کے مسلمانوں کو، صحیح یا غلط، اسی کے حکم پر سزا دی گئی۔ حراست میں قتل عام کا سیاق آتے ہی وہ بات بدل دیتا تھا۔ جب وہ مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ متشدد مسلمانوں کو سبق سکھانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان کے ساتھ ہاشم پورہ جیسی واردات کی جائے، تو میں نے اس حقیقت کی طرف اس کو متوجہ کیا کہ 1987 کے میرٹھ دنگوں کے دوران مرنے والوں میں زیادہ تر مسلمان تھے۔ اس کے چہرے پر بے اعتباری کی لکیریں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ خاکی وردی پہننے کے باوجود وہ بھی ان لاتعداد ہندوؤں میں سے ایک تھا جو یہ مانتے ہیں کہ دنگوں کے دوران مرنے والوں میں زیادہ تر ہندو ہی ہوتے ہیں۔ وجہ بھی بڑی صاف ہے ایک ظالم، متشدد اور گوشت خور فرقہ، جس کے گھروں میں ہتھیاروں کا ذخیرہ ہوتا ہے اور جو پہلے حملہ کرنے کا عادی ہے، کیسے زیادہ نقصان اٹھا سکتا ہے؟ میرا یہ سمجھانا بھی بے کار تھا کہ خود ایک پولیس افسر ہونے کے ناطے آنکڑوں تک اس کی رسائی آسان تھی اور وہ میرٹھ کے تھانوں یا کنٹرول روم سے دنگوں کے دوران مرنے والوں کی تعداد معلوم کر سکتا تھا۔

سریندر پال سنگھ کی سوچ بدقسمتی سے اس سرکاری مشینری کے اکثریتی حصے کی سوچ ہے جسے فرقہ پرستی کے شاخسانے، فرقہ وارانہ فسادات سے نپٹنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ ہاشم پورہ کیوں ہوا؟ اس کا جواب صرف 1987 کے میرٹھ میں نہیں تلاشا جا سکتا۔ جواب کی کھوج میں ہمیں تاریخ جیسے کئی سماجیاتی شعبوں سے ہو کر گزرنا ہوگا۔ یہ ایک موضوع ہے جسے میں تربیت یافتہ ماہرین سماجیات کے لیے چھوڑنا چاہوں گا۔ ایک متجسس طالب علم کی حیثیت سے، جو تکثیریت کے حامل برصغیر ہند کے بین مذہبی اور بین برادری تعلقات کی باریکیوں کو پکڑنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، میں اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں

کہ ہاشم پورہ ایک بڑی بیماری کی علامت ہے اور اسے کسی خلا میں نہیں سمجھا جا سکتا، اور جیسا کہ کہاوت ہے کہ مرض کی تشخیص کے بغیر اس کا علاج بھی نہیں ہو سکتا۔

وسیع تر سیاق میں ہندو مسلم رشتوں کی جھلک نوکر شاہی اور سیاست میں موجود ہندو مسلم کرداروں کے رولوں کے باہمی تضادات میں بھی نظر آتی ہے۔ بھارتیہ سماج اپنی ساری آئینی گارنٹیوں کے باوجود ایسی گرہوں کا شکار ہے جو ان رشتوں کو سہج بننے سے روکتی ہیں۔ خاص طور سے اکثریتی اور سب سے بڑے اقلیتی فرقے کے طویل زمانے کے باہمی رشتوں کا آسیب، کہیں نہ کہیں ان کے رویوں میں ضرور دکھائی دیتا ہے۔ میں نے اوپر تاریخ اور سماجیات جیسے موضوعات کے ذریعے سے دونوں کے بیچ کے تعلق کو سمجھنے کی کوشش کی تھی، یہاں میں مختصراً اس استثنائی رویہ کا ذکر کرنا چاہوں گا جو سیاسی اور انتظامی نوکر شاہی کے رویوں میں ہندو مسلم تناؤ کے لمحوں میں جانے انجانے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ استثنائی رویہ لگ بھگ ویسا ہی ہے جیسا ہمیں آزادی کی شروعاتی دہائیوں میں اوسط مسلم رویوں میں دکھائی دیتا تھا۔ ان دنوں کے عام تجربوں میں ایک یہ بھی تھا کہ آپ کسی مسلمان کو ہندو سامعین کے سامنے بغیر کسی سیاق کے پاکستان کی برائی کرتے پا سکتے تھے۔ یہ خود کو دیش بھکت ہندوستانی ثابت کرنے کی ان کی کوشش تھی۔ ساٹھ ستر سال گزرنے کے بعد اتنی پختگی تو آ گئی ہے کہ اب اس طرح کی قابل رحم کوشش کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے لیکن اب بھی ہندو مسلم تناؤ کے لمحوں میں آپ کسی بھی مسلم سیاسی رہنما یا نوکر شاہ کو ہکا بکا اور لڑکھڑاتے دیکھ سکتے ہیں۔

ہاشم پورہ پر کام کرتے وقت میرا سابقہ ایسے تین کرداروں سے پڑا جن کی شہرت اور ساکھ اپنے اپنے میدانوں میں ٹھیک ٹھاک تھی اور جو ہاشم پورہ اپی سوڈ میں مثبت مداخلت کر کے مجرموں کی نشان دہی کر کے انھیں سزا دلوا سکتے تھے لیکن جو شاید صرف اس لیے خاموش رہ گئے کہ وہ مسلمان ہیں اور شاید انھیں کہیں یہ لگتا تھا کہ ان کی خاموشی انھیں دیش بھکت اور سیکولر مسلمان ثابت کرنے میں مدد کرے گی، اور اس سے ان کے کریئر میں مدد

ملے گی۔ یہ تھے سی آئی ڈی کے پولیس سپرنٹنڈنٹ سید خالد رضوی جنھیں تفتیش کی نگرانی کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، غازی آباد کے ضلع مجسٹریٹ نسیم زیدی اور میرٹھ سے ایم پی اور مرکزی کابینہ میں کیبنٹ منسٹر محسنہ قدوائی۔

ایک اچھے پولیس افسر کے روپ میں مشہور، سید خالد رضوی کا تقرر، ہاشم پورہ تفتیش کی نگرانی کے لیے اسی لیے کیا گیا ہوگا کہ بعد میں تفتیش کاروں پر فرقہ پرستانہ تعصب کے الزام نہ لگائے جا سکیں، لیکن بدقسمتی سے وہ اس توقع پر کھرے نہیں اتر سکے۔ ان کا اس پورے اپی سوڈ میں بڑا اہم رول ہو سکتا تھا، اور اسے سمجھنے کے لیے ہمیں سی آئی ڈی کے کام کرنے کا طریقہ سمجھنا ہوگا۔

سی آئی ڈی میں عام طور سے کسی مقدمے کی تفتیش یا 'وِویچنا' ایک انسپکٹر کرتا ہے۔ اسے وِویچک، وویچنا ادھکاری یا انویسٹگیٹنگ آفیسر کہتے ہیں۔ وویچک کے کام کی نگرانی کی ذمہ داری پولیس سپرنٹنڈنٹ کی ہوتی ہے جو ہر مرحلے پر تفتیش کار کی رہنمائی کرتا ہے۔ تفتیش کار وقت بوقت اس سے صلاح مشورہ کرتا اور مدد لیتا ہے۔ پولیس سپرنٹنڈنٹ ہی اعلیٰ افسران کو تفتیش کی رفتار سے آگاہ بھی کراتا ہے۔ آگے ہم دیکھیں گے کہ شروع سے ہی کس طرح تفتیش کے ساتھ مجرمانہ غفلت برتی گئی اور کیسے وہ 'بے بسی' سے دیکھتے رہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کا ایک ہی کام تھا: اپنے ماتحت انسپکٹروں کی نالائقی کے ثبوتوں کا خلاصہ مختصر الفاظ میں وزیر اعظم کے دفتر اور دوسرے افسروں کو بھیجنا۔ بیچ بیچ میں وہ ان حقائق کی نشان دہی ضرور کرتے ہیں جو آگے چل کر اس اہم معاملے کی تفتیش کو منطقی انجام تک پہنچا سکتے تھے لیکن جب تفتیش کار انھیں نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتے، وہ خاموش رہتے اور کوئی مداخلت نہیں کرتے تھے۔ اگلے باب میں میں تفصیل سے تفتیش کی خامیوں پر لکھوں گا۔

22 مئی 1987 کو جب یہ سفاکانہ قتل عام ہوا، غازی آباد کے ضلع مجسٹریٹ نسیم زیدی تھے۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو مکن پور نہر پر سب سے پہلے پہنچے۔ ان کے پہلو میں

کھڑے ہوکر میں نے ان کے چہرے کے بنتے بگڑتے تاثرات دیکھے تھے اور اس اذیت اور غصے کو محسوس کیا تھا جو ایسی صورت حال میں کسی بھی مسلمان کے چہرے پر آسکتا تھا۔ لیکن میں نے وہ بے بسی بھی اسی چہرے پر محسوس کی تھی جو کچھ نہ کر پانے کے احساس سے پیدا ہوئی ہوگی۔ انتظامی ڈھانچے کو متعارف کرنے والے بھارتیہ قانونوں کے مطابق ضلع مجسٹریٹ ضلع انتظامیہ کا مکھیا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ نسیم زیدی ایک اچھی ساکھ والے کامیاب نوکرشاہ تھے اور اس وقت کے وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ کا اعتماد بھی انھیں حاصل تھا۔ بعد کے برسوں میں ان کا سروس گراف بھی ایک نوکرشاہ کے روپ میں ان کی کامیابی کی کہانی ہے۔ لیکن اس دن کیا ہوا کہ وہ خاموش ہو گئے اور زیادہ تر مجھے بولنا پڑا؟ یہ وہی بے بسی ہے جس کا شکار نسیم زیدی جیسے مسلم افسران ہاشم پورہ جیسے حالات میں ہو جاتے ہیں۔

محسنہ قدوائی میرٹھ سے کانگریس کے ٹکٹ پر چنی گئی ممبر پارلیامنٹ اور مرکزی حکومت میں کیبنٹ منسٹر تھیں۔ راجیو گاندھی کی کابینہ کی باررسوخ ممبر ہونے کے سبب یہ بہت نامناسب نہیں تھا کہ میرٹھ کے مسلمان ان سے خصوصی توقعات رکھتے تھے۔ لیکن کیا وہ ایک عوامی نمائندے کا، اور وہ بھی اقلیتی فرقے کے عوامی نمائندے کا رول صحیح معنوں میں نبھا پائیں؟ میں اوپر اس واقعے کا ذکر کر چکا ہوں جس میں موت کے منھ سے بچ نکلے ذوالفقار کو ان کے یہاں کوئی مدد نہیں ملی اور اسے تھوڑی ہی دور واقع سید شہاب الدین کی کوٹھی میں پناہ ملی۔ میرٹھ کے دنگوں میں انھیں جو کچھ جھیلنا پڑا تھا شاید وہی اس کے پیچھے سب سے بڑا سبب تھا۔ میرٹھ میں ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا تھا، اسے دیکھنا دلچسپ ہوگا۔

16 مئی سے میرٹھ میں تشدد کی شروعات ہوئی اور محسنہ قدوائی 19 مئی کو میرٹھ پہنچیں۔ اسی دن اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ، پردیش کے وزیر داخلہ گوپی ناتھ دیکشت اور مرکز سے منسٹر آف اسٹیٹ چدمبرم بھی میرٹھ پہنچے۔ چدمبرم وزیر اعظم راجیو گاندھی کے بھروسہ مند ساتھی تھے اور ان کی ہدایت پر دنگوں کے دوران میرٹھ آتے جاتے

رہے تھے۔اس لیے فطری تھا کہ ان کی ہدایات کی خصوصی اہمیت تھی۔محسنہ لوک سبھا کے لیے میرٹھ سے چنی گئی تھیں، اس لیے ان کی یہ توقع کہ میرٹھ کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کے پہلے ان سے بھی صلاح مشورہ کیا جائے، بہت فطری تھی۔لیکن پہلے ہی دن سے انھیں نظر انداز کر دیا گیا اور انھیں مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ 19 تاریخ کو بیوپاریوں کے ایک گروہ نے ان کے خلاف مظاہرہ کیا اور انھیں سرکٹ ہاؤس میں اپنا کمرہ بند کر کے چھپنا پڑا۔اسی طرح جب وہ وزیر اعلیٰ ویر بہادر کے ساتھ تھانہ کوتوالی میں دنگوں کے متعلق جانکاریاں لے رہی تھیں، ایک مشتعل بھیڑ نے انھیں گھیر لیا اور ان کے ساتھ گالی گلوج کی۔ بڑی مشکل سے پولیس انھیں بچا کر سرکٹ ہاؤس لے جا پائی۔ 19 مئی 1987 کی رات میں شہر کے باہر پَرتاپور کی ایک فیکٹری میں چدمبرم کے ساتھ وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ، وزیر داخلہ گوپی ناتھ دیکشت اور میرٹھ سے متعلق سول اور پولیس انتظامیہ کے اعلیٰ افسر میرٹھ کے بارے میں سوچ بچار کرنے کے لیے جمع ہوے۔ دل چسپ بات یہ تھی کو اس مشاورت میں محسنہ کو شریک نہیں کیا گیا۔خود کو نظر انداز کیے جانے پر دکھی محسنہ قدوائی پرتاپور کتائی مل کے گیسٹ ہاؤس میں رکے وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ کے کمرے میں دوسرے دن پہنچ گئیں اور مقامی روزنامے 'امر اُجالا' کے مطابق ''دونوں کے بیچ بند کمرے میں چار گھنٹے تک تو تو میں میں چلتی رہی۔''[5]

مذکورہ بالا تینوں مثالیں اس دھرم سنکٹ کو سمجھنے میں مدد کریں گی جن کے سبب مسلم نوکر شاہ اور سیاست داں ہاشم پورہ جیسے سنکٹ میں وہ سب بھی نہیں کر پاتے جو ہندوستانی آئین اور قانون کے مطابق قطعی جائز ہے اور جس کی ان سے توقع بھی کی جاتی ہے۔

میرے دل میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہاشم پورہ کے مسلمانوں کو سبق سکھانے کے لیے ہی یہ گھنونا قتل عام کیا گیا تھا۔میرٹھ میں پچھلے کئی مہینوں سے فرقہ وارانہ تشدد کا دور، رک رک کر جاری تھا۔ 16 مئی 1987 کی رات محلّہ قینچیان میں اجے شرما کے قتل کے بعد سے دنگوں کا ایک نیا دور شروع ہوا۔حالانکہ میرٹھ کے ضلع افسر رادھے شیام کے شک

کے مطابق واردات کے پیچھے مقتول اور اس کے مسلم مکان مالک کے بیچ لمبے وقت سے جاری کرائے داری کا جھگڑا تھا، لیکن اس معاملے میں مرنے اور مارنے والے چونکہ الگ الگ دھرموں کے تھے اور شہر کی فضا میں پہلے سے ہی تناؤ گھلا ہوا تھا اس لیے اس قتل کو فرقہ وارانہ روپ لینے میں وقت نہیں لگا۔ 17 مئی کو شہر میں نسبتاً امن رہا لیکن 18 مئی کو کئی وارداتیں ہوئیں اور 19 مئی سے حالات کے بے قابو ہو جانے کے بعد فوج بلا لی گئی۔

میں نے پولیس کے ریکارڈس کے علاوہ میرٹھ سے چھپنے والے ہندی کے دو روزناموں 'امر اجالا' اور 'دینک جاگرن' کے 16 مئی سے 31 مئی 1987 کی اشاعتیں توجہ سے دیکھی ہیں۔ ان کے مطابق شروعاتی وارداتوں میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ان میں سے دو واقعات خاص طور سے ایسے تھے جن کے سبب میرٹھ کی ضلع انتظامیہ نے مسلمانوں کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ 18/19 مئی کو 24 ویں بٹالین، پی اے سی کے ایک ہیڈ کانسٹیبل ہری شنکر کی رائفل مسلم بلوائیوں کے ذریعے لوٹ لی گئی، جسے بعد میں فوج نے ہاشم پورہ سے برآمد کیا تھا۔

21 مئی کو بھارتیہ جنتا پارٹی کی سینئر نیتا شکنتلا کوشک کے بھانجے پربھات شرما کو صبح نو بجے کے آس پاس قتل کر دیا گیا۔ شکنتلا کوشک کا گھر ہاشم پورہ کی ایک گلی محلہ عبدالوالی سے لگا ہوا تھا اور انھی کے الفاظ میں: ''میرا بڑا بھانجا ستیش میرٹھ میں ہی میجر تھا...مکان چونکہ عبدالوالی (گلی) سے سٹا ہوا تھا— صرف ہماری دیوار ہی بیچ میں ہے، تو ہمیں حفاظت کا انتظام کرنا ہوتا تھا...میرے بچے اور میری بہن کے بچے ہماری چھت پر باری باری سے پہرہ دیتے تھے، اس بیس تاریخ کی رات کو بھی پہرہ دیا، پھر صبح کو دیر سے جاگے۔ جیسے ہی یہ پانچوں بچے 21 مئی کی صبح کھڑے ہوئے تبھی اچانک پربھات کی آنکھ میں آکر گولی لگی...،،[6]

لگ بھگ اکیس برس کا پربھات کمار شرما نام کا یہ نوجوان راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کا سرگرم کارکن تھا۔ اتفاق سے میرے ہاتھ لگی ڈائری میں درج خود نوشت سوانحی یاد

داشتوں میں شکنتلا کوشک نے اسے ایک نڈر اور پرجوش کارکن کے روپ میں مصور کیا ہے جو اپنے اسکوٹر پر انھیں بٹھا کر کرفیو کے دوران دنگائیوں کے بیچ سے نکل جاتا تھا۔ شریمتی شکنتلا کوشک خود بھی دنگوں کے دوران بہت سرگرم رہتی تھیں اور پوری ڈائری ان کے 'شوریہ پورن'، بہادرانہ کارناموں سے بھری ہوئی ہے۔ پربھات کمار شرما کے قتل کا مقدمہ ضرور تھانہ سول لائنس میں درج ہوا، لیکن نہ تو اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہو سکا اور نہ ہی اس کے قاتلوں کا پتا چل سکا۔ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ کس طرح بڑے بھائی میجر ستیش شرما اور موسی شکنتلا کوشک کے رسوخ کے سبب قتل کے مقدمے میں ایک لازمی قانونی کارروائی، پوسٹ مارٹم بھی نہیں ہوئی تھی۔ تفتیش میں بھلے ہی پربھات کے قاتل کا پتا نہ چلا ہو لیکن سارے حالات اسی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ پربھات شرما کو دنگوں میں اپنی سرگرمیوں کی قیمت چکانی پڑی تھی۔

ان دو واقعات کے سیاق میں ہمیں ان دو خفیہ بیٹھکوں کو ضرور دیکھنا چاہیے جن میں ہاشم پورہ کے مسلمانوں کو سبق سکھانے کا فیصلہ لیا گیا ہوگا۔ ان بیٹھکوں کے بارے میں اس کتاب میں کئی جگہ لکھا گیا ہے اور یہ ذکر نامناسب نہ ہوگا کہ ان بیٹھکوں میں ہی کسی وقت کچھ لوگوں کے ذریعے لیے گئے فیصلے کے سبب، صرف ہاشم پورہ اور ملیانہ میں ہی سو سے زیادہ مسلمان پولیس کی زیادتیوں کے شکار ہوئے۔ سی آئی ڈی نے بھی کئی جگہ ان بیٹھکوں کا ذکر کیا ہے۔ عدالت نے فیصلے میں بھی استغاثہ کی اس کہانی کا ذکر کیا ہے جس میں کسی ایسی بیٹھک کا ذکر ہے جہاں ہاشم پورہ میں تلاشیوں اور گرفتاریوں کا فیصلہ لیا گیا تھا۔ استغاثہ یہ ثابت کرنے میں ناکام رہا کہ اس بیٹھک میں کن لوگوں نے یہ طے کیا تھا کہ مسلمانوں کو اتنا بھیانک سبق سکھایا جائے۔

❁ ❁ ❁

9

آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے

21 مارچ 2015۔ تناو کے سبب میں رات بھر سو نہیں پایا تھا۔ 28 سال بعد ہی سہی لیکن ہاشم پورہ کا فیصلہ آنے والا تھا۔ تیس ہزاری عدالت سے لگ بھگ 800 کلومیٹر دور اپنے گاؤں جو کہرا (اعظم گڑھ) میں میرا دل اسی کے آس پاس منڈرا رہا تھا۔ میں نے صبح دو تین بار اس معاملے میں سرکاری وکیل اکبر عابدی سے بات کرنے کی کوشش کی اور دس بجے کے آس پاس کامیاب بھی ہو گیا۔ اکبر نے مجھے بتایا کہ فیصلہ لنچ تک آجائے گا اور جیسے ہی انھیں کچھ پتا چلے گا وہ مجھے فون کریں گے۔ چند دنوں پہلے ہی میری ان سے ایک لمبی ملاقات ہوئی تھی جس میں انھوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ سمجھایا تھا کہ اس معاملے میں وہ ملزمین کو سزا دلانے میں کامیاب ہو جائیں گے، کیونکہ ان کے مطابق استغاثہ موقعے کے ثبوتوں سے یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے کہ جن کے خلاف مقدمہ چلایا جا رہا ہے وہ سبھی جائے واردات پر موجود تھے۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور اکبر عابدی کا فون نہیں آیا، میری بے چینی بڑھتی گئی۔ میں نے ذوالفقار ناصر کو فون کیا اور اس نے بھی مجھے یقین دلایا کہ فیصلہ آتے ہی وہ مجھے مطلع کرے گا۔ تین بجے کے آس پاس ذوالفقار کا پیغام ملا کہ سبھی ملزم چھوٹ گئے۔ پل

بھر کے لیے تو میں حیرانی سے ساکت رہ گیا۔ 28 سالوں کی لمبی جدوجہد کا کیسا انجام ہوا تھا؟ تھوڑی ہی دیر بعد میں نے خود سے سوال کیا کہ اگر ان 16 ملزمین کو سزا مل بھی جاتی تو کیا میں خوش ہوتا؟

اپنے سوال کا جواب بھی مجھے جلد ہی مل گیا۔ ہاشم پورہ ہتیا کانڈ کے معاملے میں آیا عدالتی فیصلہ بد بختانہ ضرور ہے لیکن غیر متوقع بالکل نہیں۔ اگر آپ توجہ سے اتر پردیش سی آئی ڈی کی کیس ڈائریاں پڑھیں تو آپ میری بات سے متفق ہوں گے کہ جو معاملہ پی اے سی کرمیوں کے خلاف بنایا گیا تھا اس میں کسی بھی عدالت کے لیے انھیں سزا دینا آسان نہیں تھا۔ اس معاملے میں شروع سے ہی جڑا ہونے کے سبب میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تفتیش کرنے والے پہلے ہی دن سے قاتلوں کو بچانے میں لگے ہوئے تھے۔

اگر عدالت کے سامنے کھڑے سولہ ملزم اپنے راکھ پتے چہروں کے ساتھ سر جھکائے باہر انتظار کرتی پولیس وین میں بیٹھ کر جیل چلے جاتے تب بھی مجھے خوشی نہیں ہوتی۔ اس کا سب ایک دوسرا سوال تھا جو 22/23 مئی 1987 کے اس بے چین کر دینے والی رات سے، جب میں نے تھانہ لنک روڈ کے دفتر میں بیٹھ کر باب الدین سے پورا واقعہ سنا تھا، مجھے پریشان کرتا رہا ہے۔ کیا اتنی بڑی واردات کو، جس میں 600-500 لوگوں کے درمیان سے 40 سے زیادہ لوگوں کو چھانٹا جائے اور انھیں 50 کلومیٹر دور لے جا کر مار دیا جائے، ایک سب انسپکٹر انجام دے سکتا ہے؟ اس کی آفیشیل حیثیت ایسی نہیں تھی کہ وہ اتنا اہم فیصلہ کر سکتا، اور نہ ہی اس کے ماتحت اس معاملے میں اس کا حکم مانتے اگر انھیں یہ یقین نہ ہوتا کہ ہتیا کانڈ کے بعد ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ظاہر ہے کہ انھیں ایسی معافیت بڑے افسر یا طاقتور سیاسی رہنما ہی دے سکتے تھے۔

جنھیں سی آئی ڈی نے عدالت کے سامنے ملزم کے روپ میں کھڑا کیا ان میں سب سے اونچا عہدیدار ایک سب انسپکٹر تھا۔ سی آئی ڈی کی چارج شیٹ میں درج ہے:

"تفتیش میں ایسا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوا ہے جس سے یہ پتا لگتا کہ

مذکورہ بالا گرفتار آدمیوں کے قتل کا حکم کسی سینئر افسر کے ذریعے دیا گیا ہے۔
شواہد سے یہ قتل عام کرنے کا جرم صرف انھی لوگوں کی مسخ شدہ ذہنی رویے
کا عکاس محسوس ہوتا ہے جس کے لیے صرف کرتا (کرنے والے) کو ہی
ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے، کسی اور کو نہیں۔''[1]

کیا کوئی سمجھدار آدمی اس پر یقین کر سکتا ہے؟ خود سی آئی ڈی بھی اس پر وشواس نہیں کرتی تھی۔ میرٹھ کے ڈی آئی جی نتھو لال نے وائی این سکسینہ، انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی کو 7 اگست 1989 کو لکھا کہ ''میرے ڈرائیور نے مجھے آگے بتایا کہ جس طرح کے سوال سی آئی ڈی کی ٹیم الگ الگ گواہوں سے پوچھ رہی ہے ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پی اے سی کرمی اعلیٰ افسروں کی ہدایات کے بغیر ایسا کام نہیں کر سکتے تھے۔ اگر سی آئی ڈی کے نتیجے کو فطری مان بھی لیا جائے، ڈی آئی جی/ پی اے سی، پچھمی سیکٹر، شری پی ڈی رتوڑی جو وہاں کئی دنوں سے تھے، اور پی اے سی کی تعیناتی اور کام کاج کی نگرانی قریب سے کر رہے تھے، افسروں کی کڑیوں میں سب سے مناسب شخص (اس پوچھ تاچھ کے لیے) ہوں گے۔''[2]

اس خط کو لکھنے کے پیچھے وہ گھبراہٹ تھی جو نتھو لال اور کئی بڑے افسروں کے دلوں میں سی آئی ڈی کی تفتیش کے شروعاتی دور میں پیدا ہوئی تھی۔ بعد میں جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور وہ سی آئی ڈی کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے کہ ''اس طرح سے قتل کرنا ملزمین کی مسخ شدہ ذہنیت اور تعصب کی علامت ہے'' (3 اگست 1994 کو سی آئی ڈی کے ذریعے اتر پردیش سرکار کو بھیجی گئی آخری رپورٹ)، ان کا خوف بھی دور ہو گیا۔

23 مئی 1987 کو تھانہ لنک روڈ پر بابالدین نے اور تھانہ مراد نگر پر مجیب الرحمٰن نے پی اے سی کے خلاف مقدمے لکھوائے۔ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ 24 مئی کو وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ کے حکم پر دونوں مقدموں کی تفتیش سی آئی ڈی کو سونپ دی گئی۔ عام حالات میں تو اس کی حمایت کی جانی چاہیے کیونکہ سی آئی ڈی ضلع پولیس کے مقابلے زیادہ

پیشہ ورانہ طریقے سے تفتیش کر سکتی ہے، نیز وقت اور ریسورسز دونوں معاملوں میں وہ بہتر لیس ہوتی ہے۔ لیکن بعد میں سی آئی ڈی کی تفتیش کے جو نتیجے سامنے آئے انھوں نے سب کو مایوس کیا۔ ایڈیشنل سیشنز جج سنجے جندل نے 21 مارچ کو ہاشم پورہ ہتیا کانڈ کا فیصلہ سناتے وقت کہا:

> ''تفتیش میں خامیاں اس طرح کی ہیں کہ وہ استغاثہ کے معاملے کی تہ تک جاتی ہیں۔ اور اگر ان کو نظرانداز کیا جائے تو وہ ملزمین کے خلاف سنگین بدنیتی پیدا کر سکتی ہیں۔ اور اس کے سبب انصاف کا سنگین استحصال ہو سکتا ہے.... بہت تکلیف دہ صورت حال ہے کہ بہت سے بے گناہ لوگوں کو تکلیف پہنچائی گئی ہے اور راجیہ کی ایجنسی کے ذریعے ان کی زندگی چھینی گئی ہے لیکن تفتیش کرنے والا ادارہ اور استغاثہ مجرموں کی شناخت کرنے والے قابل یقین شواہد سامنے لانے میں ناکام رہے۔''[۳]

مجھے یہ لکھنے میں کوئی جھجک نہیں ہو رہی ہے کہ تفتیش شروع کرنے کے دن سے ہی سی آئی ڈی مجرموں کو بچانے کی مہم میں لگ گئی تھی۔ اس کتاب پر کام کی ابتدا میں نے سی آئی ڈی کے ذریعے عدالت میں داخل دستاویزوں کے مطالعے سے ہی کی اور جیسے جیسے میں ان میں ڈوبتا گیا، یہ واضح ہوتا گیا کہ تفتیش مجرموں پر الزام ثابت کرنے اور ضروری شواہد جمع کر کے انھیں عدالت سے سزا دلانے کے لیے نہیں بلکہ سارے معاملے کو الجھا کر ایسے حالات پیدا کرنے کے لیے کی جا رہی تھی جن میں کسی بھی عدالت سے انھیں سزا دلانا ناممکن ہو جائے۔ کئی بار تو مجھے یہ شک ہونے لگتا تھا کہ میں استغاثے کے نہیں بلکہ صفائی کے دستاویز پڑھ رہا ہوں۔

ہندوستان میں کریمنل پروسیجر برطانوی روایات پر مبنی ہے۔ 1860 کی دہائی میں انگریزوں نے بھارت میں انڈین پینل کوڈ، کریمنل پروسیجر کوڈ اور انڈین ایویڈینس ایکٹ جیسے قانون بنائے، جن پر بھارت کا فوجداری نظام انصاف ٹکا ہوا ہے۔ اس سسٹم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی بھی ملزم کو تب تک بے گناہ مانا جاتا ہے

جب تک مدعی اس کے خلاف الزام کو بلا شک وشبہ ثابت نہ کر دے۔ کسی بھی منطقی شک کا فائدہ ملزم کو ملتا ہے۔ فوجداری کا ایک کامیاب وکیل کیا کرتا ہے؟ وہ عدالت کے دل میں مدعی کی کہانی کے لیے شک پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہاں تو جس ایجنسی کو جرم کے ثبوت اکٹھے کر کے عدالت کے سامنے پیش کرنے تھے، وہی ایجنسی اس مہم میں لگی ہوئی تھی۔

یہ اجتماعی قتل کا ایسا معاملہ تھا جس میں چھ لوگ زندہ بچ نکلے تھے اور ان میں سے تین کسی بھی ایجنسی کو 23 مئی 1987 کی صبح سے ہی مہیا تھے۔ میرٹھ میں کرفیو لگا ہوا تھا، ان 42 لوگوں کو چھوڑ کر جنھیں پی اے سی کا ٹرک URU-1493 محلّہ ہاشم پورہ، میرٹھ سے لے کر غازی آباد کی سمت میں بھاگ آیا تھا، ہاشم پورہ کے زیادہ تر مرد میرٹھ اور فتح گڑھ کی جیلوں میں بند تھے، مقتولین کے اہل خانہ اپنے گھروں میں یہ سوچ کر بیٹھے تھے کہ وہ بھی کسی تھانے یا جیل میں ہوں گے۔ ایسی صورت حال میں اگر کوئی اس واردات کی تفتیش کر رہا تھا تو اسے شروعات انھی سے کرنی چاہیے تھی۔ انھی میں سے ایک باب الدین نے 22/23 مئی کی رات مجھے پورا واقعہ بتایا تھا۔ فطری طور پر اس معاملے کا تفتیش کار سی آئی ڈی انسپکٹر، آر سی گوتم مورخہ 27 مئی 1987 کو سب سے پہلے موہن نگر اسپتال میں باب الدین کے پاس پہنچا۔ 23 مئی کو صبح ساڑھے پانچ بجے جو ایف آئی آر باب الدین نے تھانہ لنک روڈ پر بول کر لکھائی تھی اس میں اس نے صاف کہا تھا کہ "ہاشم پورہ میں خاکی کپڑے پہنے ہوئے کچھ لوگوں نے جو اپنے کو پولیس والا بتا رہے تھے..." اسے، دوسرے کچھ لوگوں کے ساتھ "ایک پیلے رنگ کے ٹرک میں بٹھا لیا تھا" اور "رات ہونے پر میرٹھ سے چلے اور راستے میں کچھ لوگوں کو گولی مار کر پھینک دیا۔ یہاں جہاں میں پڑا تھا، باقی لوگوں کو گولی مار کر پھینک کر بھاگ گئے۔"

چار دن بعد جب باب الدین کا بیان سی آئی ڈی انسپکٹر گوتم نے درج کیا تو اس کے مطابق "مجھے اور 28-29 لوگوں کو ایک پیلے رنگ کے ٹرک میں بٹھا دیا گیا۔ ہم لوگوں کو

12-14 وردی والے لوگ جن کی کاہی رنگ کی وردی تھی... پیڑ کے پتوں سے بھی زیادہ ہرے رنگ کی وردی تھی... مذکورہ وردی والے ہمیں لائے تھے۔ ان کے پاس پتلی نال کی رائفلیں تھیں... سی آر پی کانسٹبل جو اس کی حفاظتی ڈیوٹی پر تعینات ہے، کی وردی دکھلائی گئی تو وہ چودہ پندرہ لوگ جو وردی میں تھے... ان کی وردی نہیں تھی۔ مذکورہ جوان (حفاظتی ڈیوٹی) کے کارتوسوں کی کپڑے کی پیٹی جو گہرے ہرے رنگ کی ہے، کی طرف اشارہ کیا اور بتلایا، اس طرح کے گہرے ہرے رنگ والی ان کی وردی تھی۔"

اسی طرح دوسرے گھائل مجیب الرحمٰن، جو موہن نگر اسپتال میں ہی بھرتی تھا، کا بیان بھی کچھ کچھ ایسا ہی تھا۔ مجیب الرحمٰن وہ شخص ہے جس نے مرادنگر تھانے میں ایف آئی آر درج کرائی تھی۔ ایف آئی آر میں اس نے بھی واضح ذکر کیا تھا کہ اسے نہر تک پیلے ٹرک میں لانے والے اور گولی مارنے والے پولیس والے تھے لیکن اسی تاریخ کو سی آئی ڈی انسپکٹر کو دیے گئے اس کے بیان کے مطابق، "12-14 وردی والے جو لوگ اسے اور 28-29 آدمیوں کو پیلے رنگ کے ٹرک پر لے کر چلے تھے ان کی وردی کا رنگ" پیڑ کی پتی سے بھی گہرا ہرا (کاہی) رنگ تھا۔"

اپنے تفتیش کاروں کی رپورٹ کی بنیاد پر، ڈی آئی جی، سی آئی ڈی جنگی سنگھ نے اتر پردیش کے ہوم سکریٹری ماتا پرساد کو مخاطب، اس معاملے کی پہلی پروگریس رپورٹ کے ساتھ بھیجے گئے کورنگ لیٹر نمبر CB 294, 311/87، لکھنؤ، مورخہ 6 جون 1987 میں لکھا، "مدعی باب الدین اور مجیب الرحمٰن نے اپنے بیانوں میں بتایا ہے کہ لگ بھگ 12-14 لوگ انھیں ایک پیلے رنگ کے ٹرک میں بٹھا کر 30-29 لوگوں کے ساتھ ہاشم پورہ میرٹھ سے لائے تھے۔ جن لوگوں نے انھیں اور ان کے ساتھیوں کو گولی ماری تھی وہ پیڑ کے پتے سے بھی گہرے ہرے رنگ (کاہی جیسا رنگ) کے کپڑے پہنے ہوے تھے۔ جب انھیں پولیس کی باقی یونیفارم دکھائی گئی تو انھوں نے انکار کیا کہ ایسی یونیفارم نہیں پہنے تھے، ہرے رنگ کی تھی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان کی بندوقیں لمبی، پتلی

نال والی تھیں۔ جب انھیں 303. کی رائفلیں دکھائی گئیں تو انھوں نے ایسی رائفلوں سے مارنے کو منع کیا، انھوں نے بتایا کہ وہ سر پر لوہے کے ٹوپ لگائے ہوئے تھے اور ان کی بھاشا سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔''

ان قارئین کی سہولت کے لیے جو باب الدین اور مجیب الرحمٰن کے بیانوں کے پیچھے چھپے پیچ نہیں سمجھ پا رہے ہیں، میں دو مسئلے صاف کرنا چاہوں گا۔ پہلا تو یہ کہ ان دونوں کے بیان دفعہ 161 سی آر پی سی کے تحت درج کیے گئے تھے۔ یہ پرویزن خاص نوآبادیاتی حالات کی دین ہے۔ 1861 میں جب سی آر پی سی بنی، ملک میں خواندگی کی شرح بہت کم تھی، اس لیے فطری تھا کہ بیان دینے والوں سے یہ توقع نہیں کی جاتی تھی کہ وہ اپنے بیان پر دستخط کریں گے۔ ساتھ ہی جمہوری اداروں کے فقدان کے سبب یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ پولیس مار پیٹ یا دھمکا کر من مانا بیان لکھوا لے گی۔ 1973 میں سی آئی ڈی نئے روپ میں آئی ضرور، لیکن اس پروویزین کو بنے رہنے دیا گیا۔ اب بھی دفعہ 161 کے تحت درج بیان پر گواہ کے دستخط نہیں لیے جاتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پولیس افسر جو بیان درج کرتا ہے، اس میں اپنی مرضی سے کچھ بھی لکھ سکتا ہے۔ چونکہ گواہ کو بیان پر دستخط نہیں کرنے ہوتے اس لیے تفتیش کار کے سامنے اسے دکھانے کی مجبوری بھی نہیں ہوتی۔ باب الدین اور مجیب الرحمٰن کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ایسا نہیں مانا جاسکتا کہ چار دن میں ہی دونوں کی یادداشت اتنی کمزور ہوگئی ہو کہ وہ خود کو گرفتار کرنے والوں کی وردی اور ان کے ہتھیاروں کی شناخت بھول جائیں۔ پہلے لکھائی ایف آئی آر اور بعد میں عدالت میں دیے گئے بیان دونوں سی آئی ڈی انسپکٹر کے سامنے دیے گئے بیانات سے مختلف ہیں۔

یہ ماننا غلط نہیں ہوگا کہ سی آئی ڈی انسپکٹر نے باب الدین اور مجیب الرحمٰن کے بیان اپنی مرضی سے لکھے اور اس کا مقصد بعد میں عدالت کے دل میں شک پیدا کرنا بھی ہوسکتا ہے۔ باب الدین اور مجیب الرحمٰن جانتے تھے کہ پولیس کی وردی خاکی رنگ کی ہوتی ہے

اور جو لوگ انھیں ٹرک میں بھر کر لائے تھے وہ پولیس والے تھے، پھر وہ کیوں ان کی وردی کا رنگ کاہی یا 'پیڑ کے پتے سے بھی گہرے ہرے رنگ' کا بتائیں گے؟ گہرے ہرے رنگ کی وردی ہندوستانی فوج پہنتی ہے۔ اسی طرح دونوں کے بیانوں میں پتلی نلی والی رائفلوں کا ذکر آیا ہے۔ ایسی نلیاں 7.62 ایس ایل آر رائفلوں کی ہوتی ہیں جن کا استعمال 1987 تک اتر پردیش پولیس یا پی اے سی نہیں کرتی تھی۔ اس وقت اس کے پاس 303. رائفلیں ہوتی تھیں جن کی نلی کافی چوڑی ہوتی ہے اور 7.62 بور کی ایس ایل آر رائفل فوج میں استعمال ہوتی تھی۔ دونوں حقائق اس بات کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ حقیقت میں جو لوگ ہاشم پورہ سے مسلمانوں کو اٹھا کر لائے تھے اور جنھوں نے نہروں پر اتار کر انھیں مارا تھا، وہ پی اے سی والے نہیں بلکہ فوجی تھے۔

اس معاملے کے انچارج پولیس سپرنٹنڈنٹ سید خالد رضوی نے بھی اپنی ایک رپورٹ میں شک کا اظہار کیا تھا:

> ''شری باب الدین نے بیان دیا کہ مجرم ہری وردی پہنے ہوئے تھے اور ان کے پاس تنگ نلیوں والے ہتھیار تھے۔ (یہاں یہ قابل ذکر ہے کہ شری باب الدین کے ذریعے تھانہ لنک روڈ میں لکھائی گئی ایف آئی آر میں ہری وردیاں پہنے ہوئے لوگوں کا کوئی ذکر نہیں ہے) شری مجیب الرحمٰن (زندہ بچ نکلنے والا گھائل) نے بیان دیا کہ مجرم گہرے ہرے رنگ کی وردی پہنے ہوئے تھے اور جانچ کے دوران دکھائی گئی 303. رائفلوں کی طرح ہتھیار نہیں لیے ہوئے تھے (یہاں یہ ذکر کیا جا سکتا ہے کہ شری مجیب الرحمٰن کے ذریعے لکھائی گئی ایف آئی آر میں گہرے ہرے رنگ کی وردی کا کوئی ذکر نہیں ہے اور ہنڈن نہر سے ملنے والی ایک لاش سے نکلی گولی کے ٹکڑے کے بارے میں حاصل بیلسٹک رپورٹ کے مطابق وہ 303. بور کی رائفل سے چلائی گئی تھی)۔''[۱۴]

لیکن رضوی اعلیٰ افسر کی حیثیت سے اپنے ماتحت انسپکٹر کو اس مجرمانہ شرارت سے

روک کیوں نہیں پائے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مسلمان افسر ہونے کے سبب وہ بھی ایک خاص طرح لاچاری اور بے بسی کا شکار ہو گئے تھے؟ میرا ماننا ہے کہ ایسا ہی تھا اور میں پچھلے باب میں اس پر لکھ چکا ہوں۔

موہن نگر اسپتال میں باب الدین اور مجیب الرحمٰن کا موت سے پہلے دیا گیا بیان مجسٹریٹ شریمتی سنیہہ لتا اگروال نے 24 مئی کو لیا۔ باب الدین مکن پور میں ہنڈن نہر کے کنارے ہمیں ملا تھا لیکن مجسٹریٹ نے اس کے بیان میں لکھا کہ وہ مرادنگر میں مار کر پھینکا گیا تھا اور اسے مرادنگر چوپلا پر پولیس کے ذریعے پھر سے پکڑا گیا۔ سی آئی ڈی نے بھی بعد میں مجسٹریٹ کا بیان لکھتے وقت تبصرہ کیا ہے کہ وہ ''یہ بھی نہیں بتلا سکے کہ اس گھائل کی جائے واردات ہنڈن نہر ہے تو مرادنگر نہر میں اپنا پھینکا جانا کیوں بتلایا ہوگا۔ اسی طرح مرادنگر چوپلا پر جو پھر سے پولیس کے ذریعے پکڑا جانا بتلایا گیا ہے، وہ پولیس کون تھی اور کہاں کی تھی جبکہ وہ مرادنگر میں تھانے پر لے جایا ہی نہیں گیا تھا؟...واقعات کی کڑیوں اور حقائق کے خلاف لکھے گئے متعلقہ بیانوں کے موضوع کے سلسلے میں پوچھ تاچھ پر وہ کوئی بھی صاف بیان درج نہیں کرا سکے ہیں۔'' باب الدین سے بعد میں اس سلسلے میں پوچھا گیا تو وہ خود چکرا گیا اور نہیں سمجھ پایا کہ اس کا یہ بیان مجسٹریٹ نے کیوں لکھا ہوگا جبکہ اس نے تو ایسا تو کچھ نہیں کہا تھا۔

تفتیش کے دوران ایک قطعی لاپروائی پولیس کے ذریعے واردات میں استعمال کیے جانے والے ٹرک کو فوراً ضبط نہ کرنا تھا۔ میں نے اوپر لکھا ہے کہ 22/23 مئی کی آدھی رات جب ہم اکتالیسویں بٹالین کے کیمپس میں پہنچے، صوبیدار سریندر پال سنگھ ٹرک نمبر URU-1493 کو دھونے کے بعد اسے لے کر واپس میرٹھ بھاگ گیا تھا۔ یہ فطری تھا کہ تھانہ لنک روڈ کے انچارج سب انسپکٹر وی بی سنگھ سے، جو لگ بھگ 24 گھنٹے اس معاملے کا تفتیش کار بھی رہا، یہ امید کی جاتی کہ وہ بٹالین کے ایم ٹی سیکشن سے خون ملا پانی اکٹھا کر لے اور اسے سائنسی جانچ کے لیے فارینسک سائنس لیبوریٹری بھیجے، لیکن وہ ایسا

نہیں کر سکا اور اس کے لیے سی آئی ڈی نے اسے سزا دینے کی سفارش بھی کی۔ آج جب آرام سے بیٹھ کر ہم اس پہلو پر غور کریں تو یہ صحیح بھی لگتا ہے لیکن اس رات کیا یہ ممکن تھا؟ میں نے اوپر لکھا ہے کہ چونکہ یہ معاملہ پی اے سی سے متعلق تھا، اس کے ساتھ ایک خاص طرح کی نزاکت وابستہ تھی۔ میں نے ان حالات کا ذکر کیا ہے جن میں میں نے اور ضلع مجسٹریٹ نسیم زیدی نے یہ طے کیا تھا کہ کوئی کارروائی کرنے کے پہلے اتر پردیش کے پولیس ڈائرکٹر جنرل بھٹناگر کو میرٹھ جا کر پورے واقعہ کی جانکاری دی جائے۔ یہاں دو مثالیں دینا بے محل نہ ہوگا۔

ڈی آئی جی میرٹھ، نتھو لال نے آئی جی، سی آئی ڈی، وائی این سکسینہ کو 7 اگست 1989 کو لکھا، ''میں نے یہ بھی درخواست کی تھی کہ پی اے سی کی ٹکڑی کو فوراً ہٹا دیا جائے اور ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ اس پر، شری ڈی ایس بھٹناگر کے دل میں کچھ خدشات تھے اور وہ وہاں موجود ڈی آئی جی، پی اے سی، پچھمی سیکٹر سے کچھ صلاح مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ رتوڑی (ڈی آئی جی، پی اے سی، پچھمی سیکٹر) سے صلاح مشورہ کر کے شری بھٹناگر نے وزیر اعلیٰ کو بتایا کہ اس وقت پی اے سی کے خلاف کسی بھی کارروائی سے پی اے سی کرمیوں پر الٹا ردعمل ہوسکتا ہے اور پی اے سی میں بغاوت کے امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔''[۵]

ضلع مجسٹریٹ نسیم زیدی نے سی آئی ڈی کے سامنے بیان دیتے ہوے کہا، ''کیونکہ یہ معاملہ بہت حساس لگ رہا تھا اور پی اے سی سے متعلق تھا اس لیے انھوں نے (بیان دینے والے نے) پولیس سپرنٹنڈنٹ سے صلاح مشورہ کر کے یہ مناسب سمجھا کہ اس معاملے کی جانکاری پولیس ڈائرکٹر جنرل، کمشنر میرٹھ وغیرہ کو ذاتی طور پر دے دی جائے۔''

24 مئی کو تفتیش سی آئی ڈی کو سونپ دی گئی۔ اسی دن پلاٹون کمانڈر سریندر پال سنگھ اور اس کی ٹکڑی کو میرٹھ سے ہٹا کر مراد آباد بھیج دیا گیا اور ان کے ہتھیار رکھوا لیے گئے۔ اس کے بعد یہ ممکن ہو گیا تھا کہ واردات میں شریک ٹرک کو ضبط کر لیا جاتا اور اگر اسی وقت

اس کی سائنسی جانچ کرائی جاتی تو ممکن ہے کہ بہت سارے ایسے شواہد اس ٹرک سے ملتے جو بعد میں تفتیش اور استغاثہ میں مدد کرتے۔ ٹرک کی کئی مہینے بعد فارینسک جانچ کرائی گئی اور اس میں کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ جانچ کرنے والوں کو اس میں اپنے مطلب کا کچھ خاص نہیں ملا۔ تفتیش سونپے جانے کے بعد اگر سی آئی ڈی نے ایم ٹی سیکشن میں جا کر تلاش کیا ہوتا تو اسے وہاں خون ملی مٹی اور پانی کے شواہد بھی مل گئے ہوتے۔ مجھے آج بھی لگتا ہے کہ سب انسپکٹر وی بی سنگھ کو اس معاملے میں دی گئی سزا اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ سزا تو سی آئی ڈی کو ملنی چاہیے تھی۔

تفتیش کا سب سے المناک پہلو اس کے بعد آتا ہے۔ تفتیش کاروں کو سب سے پہلے پڑتال کرنی چاہیے تھی کہ اتنی بڑی واردات ہوئی کیوں، کس نے اس کا فیصلہ کیا اور کیسے سریندر پال سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو تیار کیا گیا کہ وہ بے خوف اسے انجام دیں۔ چارج شیٹ داخل کرتے وقت سی آئی ڈی نے سفاکانہ قتل عام کے لیے اس میں شامل 19 پی اے سی کرمیوں کی 'مسخ ذہنیت' کو ہی ذمہ دار ٹھہرایا تھا لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ایسی ٹکڑی، جس کا سب سے اونچا عہدیدار ایک سب انسپکٹر تھا، اتنی بڑی واردات کر سکتی تھی؟

میں نے پیچھے تفصیل سے لکھا ہے کہ بھاجپا نیتا شکنتلا کوشک کی بہن کا لڑکا پربھات ان کے گھر کی چھت پر مارا گیا تھا۔ یہ 21 مئی 1987 کی صبح کا واقعہ ہے، جب دن ابھی چڑھنا شروع ہی ہوا تھا کہ چھت کی منڈیر پر کھڑے پربھات کی آنکھ میں گولی لگی اور اس کے برابر میں موجود شکنتلا کوشک کا ایک لڑکا بھی زخمی ہوا تھا۔ اسپتال لے جانے پر پربھات کو مردہ قرار دے دیا گیا۔ پربھات کا بڑا بھائی میجر ستیش چندر شرما میرٹھ چھاؤنی میں ای ایم ای سینٹر میں تعینات تھا۔ تفتیش کی ابتدا میں جتنی بھی رپورٹیں سی آئی ڈی کے ذریعے تیار کی گئیں سب میں دو حقائق کا خصوصی ذکر ہے: ایک تو پربھات شرما کا 21 مئی کو قتل اور اس سے ہاشم پورہ سے وابستہ امکانات، جس کا ذکر سید خالد رضوی کی مذکورہ بالا

رپورٹ میں آتا ہے اور دوسرا ایک ایسا فیکٹ ہے جو اس معاملے میں بہت اہم روشنی ڈال سکتا ہے۔سی آئی ڈی نے اپنی کئی رپورٹوں میں یہ ذکر کیا ہے کہ 22 مئی کی شام جب ہاشم پورہ میں تلاشیاں چل رہی تھیں میجر ستیش چندر شرما وہاں موجود تھا۔دو وجہوں سے اسے وہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔نہ تو اس کی ڈیوٹی وہاں تھی اور نہ ہی گھریلو اسباب سے اس کا وہاں ہونا بنتا تھا۔جس یونٹ کو دنگوں میں سول انتظامیہ کی مدد کے لیے تعینات کیا گیا تھا وہ اس کا حصہ نہیں تھا۔اس کے چھوٹے بھائی پربھات کا قتل ہوئے ابھی چھتیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے۔اس کی موسی شکنتلا کوشک کی ڈائری کے مطابق پربھات کے ماتا پتا یعنی ان کے ''بہن بہنوئی کا (رورو کر) برا حال تھا۔'' ایسے سمے میں تو ستیش کو اپنے ماں باپ کو دلاسہ دینے کے لیے گھر پر ہونا چاہیے تھا۔ پھر وہ ہاشم پورہ میں کیا کر رہا تھا؟ ایک دو نہیں آدھے درجن سے زیادہ گواہوں نے اسے پہچانا اور تلاشیوں کے دوران اس کی موجودگی کی تصدیق کی ہے۔پھر سی آئی ڈی نے اس کے رول کی سنجیدگی سے جانچ پڑتال کیوں نہیں کی؟ رپورٹوں میں تو اس کا ذکر آتا رہا لیکن نہ تو اسے کبھی بیان کے لیے سی آئی ڈی کے سامنے طلب کیا گیا اور نہ ہی تفتیش کاروں نے اس کی جائے واردات پر موجودگی کے پیچھے چھپے معنی تلاش کرنے کی کوششیں کیں۔

میرٹھ میں دنگوں کے دوران کنٹرول روم میں صبح شام بیٹھکیں ہوتی تھی۔یہ ایک نارمل روایت ہے کہ ہر دنگے کے دوران اتر پردیش کے کسی بھی ضلع ہیڈ کوارٹر میں ایسی بیٹھکیں ہوتی ہیں۔ بریفنگ اور ڈی بریفنگ کے لیے منعقدہ ان بیٹھکوں میں دن بھر کے واقعات کا تجزیہ ہوتا ہے اور اگلی تلاشیوں اور گرفتاریوں کی یوجنا تیار کی جاتی ہے۔مئی 1987 کے دنگوں کو لے کر ہو رہی ان بیٹھکوں میں اس بار ایک غیر فطری چیز ہو رہی تھی۔ ان بیٹھکوں میں فوجی افسران ایک ایسے رول میں نظر آرہے تھے جس کی ان سے توقع نہیں کی جاتی تھی۔دنگوں کے دوران ہندوستان کے آئین اور سی آر پی سی کے تحت سول انتظامیہ کی مدد کے لیے بلائی گئی فوجی ٹکڑی کا کیا رول ہو سکتا ہے،اس پر میں تفصیل سے

لکھ چکا ہوں۔ سی آئی ڈی کے سامنے دیے گئے بیانوں میں میرٹھ کے ڈی آئی جی نتھو لال، ضلع مجسٹریٹ رادھے شیام کوشک، سینئر پولیس سپرنٹنڈنٹ وی کے بی نائر اور گردھاری لال شرما نے جگہ جگہ کہا ہے کہ تلاشیوں کا منصوبہ فوج بناتی تھی اور گرفتاریوں کی اطلاع بھی وہی اپنے ہیڈکوارٹروں کو بھیجتی تھی۔ یہ ایک ایسی صورت حال تھی جو پوری طرح سے غیر قانونی ہے اور اس تک پہنچنے میں میرٹھ انتظامیہ کی پست ہمتی، نالائقی اور تال میل کا فقدان پوری طرح سے ذمہ دار ہے۔

21 مئی کو میجر ستیش چندر شرما کے بھائی پربھات کے قتل کے بعد فوج زیادہ فعال ہوئی۔ اسی دن دیر شام کو پربھات کے شوداہ (آخری رسومات) میں اعلیٰ فوجی اور غیر فوجی افسران شامل ہوے۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی کہ میرٹھ کے ضلع مجسٹریٹ اور اعلیٰ پولیس افسران آخری رسومات میں شریک ہوتے لیکن دل چسپ بات ہے کہ سبھی اعلیٰ افسران نے کوشک پریوار کی دکھ کی اس گھڑی میں بھی شرکت سے انکار کر دیا جبکہ ان کے ماتحتوں نے سی آئی ڈی کو دیے اپنے بیانوں میں ان کی اس موقعے پر موجودگی کی توثیق کی ہے۔ شاید بیان دینے تک انھیں احساس ہو گیا تھا کہ پربھات کے قتل اور ہاشم پورہ کی واردات کے باہمی تعلق کو تلاش کی جائے گا اور انھوں نے پربھات کی موت سے وابستہ عام انسانی سطح کے ردعمل سے بھی دوری بنانی شروع کر دی۔

میرا ماننا ہے کہ 21 اور 22 مئی کو ہوئی بیٹھکوں میں یہ طے ہوا تھا کہ ہاشم پورہ کے مسلمانوں کو سبق سکھایا جائے۔ یہ ایک عام طریقہ ہے کہ کنٹرول روم کی بیٹھکوں کے کوئی منٹس نہیں رکھے جاتے، اور اس بار بھی یہی ہوا۔ ایس پی سی آئی ڈی، ایس کے رضوی نے وزیر اعظم کے دفتر کو بھیجے اپنے ایک نوٹ میں تبصرہ کیا تھا:

> ''22/5/87 کو ہاشم پورہ میں ہوئی تلاشیوں کے تعلق سے تلاشیوں سے پہلے کسی بھی سطح پر تفصیلی تحریری احکامات جاری نہیں کیے گئے تھے، کوئی بھی انتظام یا طریقہ کار طے نہیں کیا گیا تھا، اختیارات کی کوئی قطعی

ذمہ داریاں نہیں طے کی گئی تھیں اور نہ ہی ان کی جواب دہی رکھی گئی تھی
جن کے سبب یہ وارداتیں ممکن ہو سکی تھیں۔''۱

ان بیٹھکوں کا ذکر الگ الگ افسروں کے سی آئی ڈی کو دیے گئے بیانوں میں آیا ہے۔ یہاں دو کا ذکر کافی ہوگا:

ایس پی (سٹی) بی کے چترویدی کے مطابق ''مورخہ 22.5.87 کو دوپہر کے سے لگ بھگ ایک بجے دن کے میٹنگ ہوئی تھی جس میں انھیں بھی بلایا گیا۔ اس میٹنگ میں ان کے علاوہ سینئر پولیس سپرنٹنڈنٹ شری وی کے بی نائر، ضلع ادھکاری شری کوشک، میجر جنرل شری کھرانہ، سی او سٹی، اپر پولیس سپرنٹنڈنٹ شری بھگت وغیرہ افسران بھی تھے۔ اس میٹنگ میں یہ طے ہوا کہ اس دن مورخہ 22.5.87 کو محلہ ہاشم پورہ، زیدی فارم، ملیانہ (سلطانپور) میں تلاشیاں لی جائیں۔ تلاشیوں کا بنیادی مقصد غیر قانونی ہتھیاروں کی برآمدگی، لاؤڈ اسپیکر اتروانا اور مطلوب ملزمین کی تلاش، کرفیو کا نفاذ اور کرفیو توڑنے والوں کو قید کرنا تھا۔ میجر جنرل شری کھرانہ نے یہ ہدایات دی تھیں کہ 16 سال تک کے بچوں، عورتوں اور ساٹھ برس سے زیادہ عمر والے لوگوں کو گرفتار نہ کیا جائے ...ان تلاشیوں کے لیے کوئی تحریری حکم نہیں دیا گیا تھا۔'' کوئی نہیں جانتا کہ اس بیٹھک میں میجر جنرل کھرانہ کس قانونی حیثیت سے حکم دے رہے تھے اور کیوں میرٹھ کے افسران ان احکامات پر عمل درآمد کر رہے تھے؟

سٹی مجسٹریٹ مکیش کمار گپتا نے، جو ہاشم پورہ کے سیکٹر مجسٹریٹ تھے، 22 مئی کے واقعات کو یاد کرتے ہوئے سی آئی ڈی کو بتایا کہ ''ہاشم پورہ محلے میں ڈیڑھ دو بجے... کے فوراً بعد فائرنگ اور نعرے بازی کا واقعہ ہوا۔ اسی دوران ایس ایس پی شری نائر صاحب اور ایس پی سٹی شری چترویدی اور ڈسٹرکٹ کلکٹر شری کوشک صاحب بھی آ گئے تھے۔ جنھوں نے کہا کہ ابھی کوئی قانونی کارروائی نہیں ہوئی ہے، میٹنگ کے بعد غور و فکر کر کے بتلایا جائے گا...''

میٹنگ کے بعد ہاشم پورہ میں تعینات افسروں کو حکم ملا کہ وہ آپریشن شروع کر دیں۔ اس کی توثیق سٹی کنٹرول روم کی لاگ بک مورخہ 22.5.87 سے ہوتی ہے جس کے مطابق ''16 بج کر 27 منٹ پر ایس پی سٹی کو بتلایا گیا ہے کہ وہ کام شروع کرا دیں۔ 18 بج کر 2 منٹ پر ڈسٹرکٹ کلکٹر کو بتلایا گیا کہ سیکٹر آفیسر ہاشم پورہ نے لگ بھگ 400 گرفتاریاں کی ہیں۔''

جن میٹنگوں میں یہ طے ہوا کہ ہاشم پورہ کے مسلمانوں کو سبق سکھایا جائے، ان کا واضح ذکر تو سی آئی ڈی کی مختلف دستاویزوں میں آتا ہے لیکن ایسی کوئی بھی سنجیدہ کوشش اس کی تفتیش میں نظر نہیں آتی جس سے ان میں شریک ہونے والوں کی شناخت اور ان کے ذریعے لیے گئے فیصلوں کی پڑتال کی جا سکتی۔ ایس پی (سٹی)، بی کے چترویدی یہ جانکاری دینے والے ایک اہم گواہ ہو سکتے تھے لیکن سی آئی ڈی کے ذریعے کئی بار پولی گراف ٹیسٹ کے لیے بلائے جانے پر بھی وہ نہیں آئے اور کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ یہی بے بسی اس وقت بھی دکھائی پڑتی ہے جب ہم پاتے ہیں کہ کئی بار بلانے پر بھی میجر پٹھانیا عدالت کے سامنے پیش نہیں ہوا۔

جج سنجے جندل نے ملزموں کو بری کرتے وقت کہا کہ استغاثہ یہ ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے کہ عدالت کے سامنے پیش کیے گئے 16 ملزم ہی وہ آدمی تھے جنھوں نے قتل کیا تھا۔ میں نے کئی برس تک اس معاملے سے وابستہ اور ہزاروں صفحات میں پھیلے دستاویزوں کا مطالعہ کیا ہے اور میرے دل میں بھی یہی شک رہا ہے۔ خاص طور سے یہ شک تب اور گہرا ہو جاتا ہے جب آپ یہ پاتے ہیں کہ ملزمین میں ایک مسلمان سمیع اللہ بھی تھا۔ کیا یہ مانا جا سکتا ہے کہ پی اے سی کا ایک مسلمان جوان فرقہ وارانہ منافرت پر مبنی بے گناہ مسلمانوں کے قتل میں شریک ہوگا؟ اور کیا ہندو جوانوں کی ٹکڑی کا نائک سریندر پال سنگھ اس پر اعتماد کر کے اسے اپنے کالے کرتوت کا شریک بنائے گا؟ اپنی لچر تفتیش میں سی آئی ڈی نے عدالت کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی اور اس میں پوری طرح سے

ناکام ثابت ہوئی۔

کتاب پر کام کرتے وقت سی آئی ڈی کا ایک ایسا دستاویز میرے ہاتھ لگا جس کی اگر تفتیش میں گہرائی سے چھان بین کی جاتی تو یہ راز بھی کھل جاتا کہ اس واردات میں پلاٹون کمانڈر سریندر پال سنگھ کے ساتھ کون کون شریک تھا۔

سی آئی ڈی کے ایس پی، ایس کے رضوی نے مورخہ 24 مئی 1989 کو چوتھی پروگریس رپورٹ بھیجتے وقت لکھا کہ:

''شری سریندر پال سنگھ، پلاٹون کمانڈر نے اپنے بیان کے درمیان میں ایک کاغذ کو، جس پر اس کی یادداشتیں درج تھیں، بار بار دیکھ کر بیان دے رہا تھا، جسے دکھلانے سے پہلے تو اس نے منع کیا، پھر کافی کوشش کرنے پر اس نے مذکورہ کاغذ کو دکھایا تو اس کے جائزے سے پایا گیا کہ مورخہ 22.5.87 کی اس دن ڈیوٹی میں اس کے ساتھ درج ذیل کرمچاری رہے ہیں:

''1۔ نایک راج ویر 2۔ کانسٹبل کنور پال، 3۔ کانسٹبل لیلا دھر، 4۔ ہیڈ کانسٹبل بدھی سنگھ، 5۔ کانسٹبل اوم پرکاش، 6۔ کانسٹبل 21 اوم پرکاش، 7۔ ہیڈ کانسٹبل نرنجن لال، 8۔ ہیڈ کشن کمار 9۔ کانسٹبل جے پال سنگھ، 10۔ کانسٹبل جے دھیان، 11۔ کانسٹبل اوم پرکاش، 12۔ کانسٹبل لال سنگھ، 13۔ کانسٹبل شرون کمار، اور 14۔ کانسٹبل/ڈرائیور محکم سنگھ۔''

یہاں سریندر پال سنگھ اوم پرکاش نام تین بار لکھتا ہے۔ یہ غلطی سے بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کی اس نام کے ایک سے زیادہ آدمی اس کے گروپ میں رہے ہوں کیونکہ اوم پرکاش نام اس علاقے میں بہت عام ہے۔

ایک بار اتنا اہم دستاویز ہاتھ لگنے کے بعد سی آئی ڈی نے اس کی بنیاد پر مذکورہ 14 پی اے سی کرمیوں کا ملوث ہونا ثابت کرنے کے لیے دیگر ضروری شواہد کیوں نہیں اکٹھے کیے اور کیوں ایسے 19 لوگوں کے خلاف چارج شیٹ داخل کر دی جن میں سے کئی کے نام

اس فہرست میں تھے ہی نہیں۔سی آئی ڈی نے جن کے خلاف چارج شیٹ داخل کی وہ یہ تھے:1۔سریندر پال سنگھ،2۔سریش چندر شرما،3۔نرنجن لال،4۔کمل سنگھ،5۔کش کمار، 6۔رام بیر سنگھ،7۔سمیع اللہ،8۔مہیش پرساد،9۔جے پال سنگھ،10۔رام دھیان،11۔ شرون کمار،12۔لیلا دھر،13۔ہم بیر سنگھ،14۔کنور پال سنگھ،15۔بدھا سنگھ،16۔ بدھی سنگھ،17۔محکم سنگھ،18۔اوم پرکاش شرما،19۔بسنت ولبھ۔

چارج شیٹ میں مذکور 19 میں سے تین 1۔سریندر پال سنگھ،2۔کش کمار،اور 3۔ اوم پرکاش شرما مقدمے کے دوران مر گئے اور 16 ملزمین کے خلاف کارروائی ہوئی۔اگر ہم سریندر پال سنگھ کے پاس ملی پرچی اور چارج شیٹ میں درج ناموں کا تقابل کریں تو یہ صاف ہو جاتا ہے کہ ان میں صرف 1۔کانسٹبل کنور پال،2۔کانسٹبل لیلا دھر،3۔ہیڈ کانسٹبل بدھا سنگھ،4۔کانسٹبل اوم پرکاش (اگر چارج شیٹ میں مذکور اوم پرکاش شرما اور سریندر پال کے پاس ملے کاغذ کا اوم پرکاش ایک ہی ہے)،5۔ہیڈ کانسٹبل نرنجن لال، 6۔ہیڈ کانسٹبل کش کمار،7۔کانسٹبل جے پال سنگھ،8۔کانسٹبل رام دھیان 9۔کانسٹبل شرون کمار،اور 10۔کانسٹبل/ڈرائیور محکم سنگھ کے نام دونوں فہرستوں میں شامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بقیہ سریش چند شرما،کمل سنگھ،رام بیر سنگھ،سمیع اللہ،مہیش پرساد، ہم بیر سنگھ،بدھی سنگھ اور بسنت ولبھ کے خلاف سی آئی ڈی نے غلط فرد جرم داخل کی۔

جو قارئین اتر پردیش پولیس یا پی اے سی کے کام کرنے کے طریقے سے واقف نہیں ہیں،انھیں یہ عجوبہ لگ سکتا ہے لیکن اسے سمجھنا بہت مشکل نہیں ہے۔اکثر یہ ہوتا ہے کہ کاغذوں پر کسی سیکشن،پلاٹون یا کمپنی کے ممبر کے روپ میں دکھائے گئے کرمیوں میں سے آپریشن کے دوران کچھ چھوٹ جاتے ہیں اور ان میں کچھ ایسے لوگ جڑ جاتے ہیں جن کے نام ڈیوٹی روسٹروں میں نہیں ہوتے۔یہاں بھی یہی ہوا ہوگا۔محنت سے بچنے کے لیے سی آئی ڈی نے ان 19 لوگوں کے نام چارج شیٹ داخل کر دی جو سریندر پال سنگھ کے پلاٹون کے کاغذ پر ممبر تھے۔انھوں نے تفصیل میں جانے کی زحمت نہیں اٹھائی کہ اس

گھنونے ہتیا کانڈ میں کون سے نئے لوگ جڑ گئے تھے اور کون پرانے چھوٹ گئے تھے؟ کچھ نئے لوگوں کا جڑنا اور پرانے لوگوں کا چھوٹنا اس لیے بھی فطری لگتا ہے کہ ہاشم پورہ جیسے گھنونے ہتیا کانڈ میں نہ تو ہر شخص خوشی سے شریک ہوتا اور نہ ہی سریندر پال سنگھ ہر کسی پر یقین کر کے اسے اپنے ساتھ رکھتا۔ یہی سبب تھا کہ سی آئی ڈی نے سمیع اللہ کو ملزم بنانے جیسا مضحکہ خیز کام کر ڈالا تھا۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں ہم ان حالات کو بہتر سمجھ سکیں گے جن کے سبب جج سنجے جندل نے یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ 22 مئی 1987 کو ہاشم پورہ میں تلاشیوں کے دوران غیر قانونی ڈھنگ سے مسلمانوں کو اٹھایا گیا، انھیں ایک پیلے رنگ کے ٹرک میں بٹھا کر غازی آباد کی دو نہروں پر لایا گیا اور وہاں پی اے سی کرمیوں کے ذریعے مار دیا گیا، کسی ملزم کو گناہ گار نہیں مانا اور سب کو رہا کر دیا۔

اس غیر پیشہ ورانہ تفتیش میں کچھ بھی عجوبہ نہیں ہے۔ پچھلی کچھ دہائیوں میں سی آئی ڈی ایک پیشہ ور ادارے سے ایک ایسی ڈمپنگ گراؤنڈ میں تبدیل ہو چکی ہے، جس میں ناکارہ اور طاقتور نیتاؤں کے غیض کا نوالہ بنے افسروں کو پناہ ملتی ہے۔ ایک زمانے میں اچھی تفتیش کے لیے معروف اس ادارے پر لیپا پوتی اور مجرموں کو بچانے کی کوشش کرنے کے الزام لگنا اب عام ہو گیا ہے۔

ہاشم پورہ کی تفتیش کا گراف لکھنؤ میں بننے بگڑنے والے اقتدار کے ایکویشنز سے بھی سیدھا وابستہ دکھائی دیتا ہے۔ 1987 کی مئی میں جب یہ کانڈ ہوا تو اتر پردیش میں کانگریس کی سرکار تھی اور ویر بہادر سنگھ اس کے وزیر اعلیٰ تھے۔ ویر بہادر سنگھ کے بارے میں اوپر لکھ ہی چکا ہوں کہ وہ زمینی نیتا تھے اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے سیاہ سفید کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اس مفہوم کے کئی اشاروں کے باوجود کہ ہاشم پورہ کے مسلمانوں کو سبق سکھانے کا فیصلہ ان کے اشارے پر کیا گیا تھا، میرا دل کبھی اسے ماننے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔ جب کوئی اس سلسلے میں ان کے رول کا ذکر کرتا ہے میری آنکھوں کے سامنے

23-22 مئی 1987 کا وہ منظر گھوم جاتا ہے جب میرٹھ ترا ہے پر ان کی کار روک کر میں نے اور نسیم زیدی نے ہتیا کانڈ کی اطلاع انھیں دی تھی۔ ان کے چہرے پر آتے جاتے تاثرات کو میں آج تک نہیں بھولا ہوں۔ ایک زمینی نیتا ہونے کے کارن شاید انھیں سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ دہلی سے اتنے قریب واقع ہونے والا یہ برا واقعہ ان کا سیاسی مستقبل چوپٹ کر سکتا ہے۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ویر بہادر سنگھ کے لیے ہاشم پورہ کے اس سے زیادہ کوئی معنی نہیں تھے۔ 42 لوگوں کا حراستی قتل نہ تو ان کے لیے کوئی انتظامی چنوتی تھا اور نہ ہی اتنے اقلیتی افراد کا ایک ساتھ مارا جانا سیکولر جمہوریۂ ہند کے لیے کسی طرح کا خطرہ تھا۔ وہ نیتاؤں کی اس فصل کی پیداوار تھے جن کے لیے سیکولرزم صرف چناوی کامیابی کی گارنٹی تک ہی اہمیت رکھتا ہے۔ میرٹھ میں 1987 کے دنگوں کے دوران ملیانہ میں بھی ایسی ہی ایک واردات ہوئی تھی جس میں کئی درجن مسلمان مارے گئے تھے۔ واقعہ کی سنگینی کا احساس صوبائی سرکار کو بھی ہوا اور اس وقت کے وزیرِ داخلہ گوپی ناتھ دیکشت نے پی اے سی کے گناہ گار کمانڈنٹ آر ڈی ترپاٹھی کو معطل کرنے کا اعلان بھی صحافیوں کے سامنے کیا تھا لیکن آدیش کبھی جاری نہیں ہوا۔ شاید انتخابی الجبرا میں یہی سود مند بھی تھا۔ 22 مئی 1987 کے بعد ایک سال سے کچھ زیادہ عرصے، 24 جون 1988 تک ویر بہادر سنگھ اتر پردیش سرکار کے مکھیا بنے رہے اور اسی عرصے میں سی آئی ڈی نے تفتیش میں سب سے زیادہ لیپا پوتی کی تھی۔ ان کا ایک اشارہ ہی اس معاملے میں تیزی لانے اور اسے منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے کافی ہوتا لیکن ایسے کوئی شواہد نہیں ملتے جنھیں ہم ان کی نیک نیتی کے روپ میں پیش کر سکیں۔

1987 سے 1996 تک، جب اس مقدمے میں غازی آباد سیشنز عدالت میں فرد جرم داخل ہوئی، اتر پردیش میں کئی سرکاریں بنیں بگڑیں لیکن کسی نے بھی اسے چنوتی کے روپ میں قبول نہیں کیا۔ مقدمہ عدالت میں گھسٹتا رہا۔ تین درجن سے زیادہ سمن، ضمانتی

وارنٹ اور غیر ضمانتی وارنٹ جاری ہونے کے بعد سنہ 2000 میں ملزم عدالت میں حاضر ہوے اور انھیں ضمانت پر چھوڑ دیا گیا۔ مقدمے کی سست رفتار سے آشفتہ ہو کر مقتولین کے اقربا نے سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا اور 2002 میں اس کے حکم سے مقدمہ دہلی کے سیشنز کورٹ میں منتقل ہوا۔ اس کے بعد بھی کئی برسوں تک پبلک پروسیکیوٹر کے تقرر کا قضیہ چلتا رہا اور 2006 میں ملزمین کے خلاف الزامات طے ہو پائے۔ اس دوران اقتدار میں رہی اتر پردیش کی کسی بھی سرکار کا دامن ہاشم پورہ معاملے میں پاک صاف نہیں رہا۔

1987 میں مرکز میں راجیو گاندھی کی لیڈر شپ والی کانگریسی سرکار تھی۔ مجھے یہ لکھنے میں کوئی تردد نہیں ہے کہ ہاشم پورہ جیسی بڑی چنوتی میں اس کا رویہ بھی ملا جلا تھا۔ 23 مئی کی علی الصبح میں نے باب الدین، مجیب الرحمٰن اور محمد عثمان کو موہن میکنس اسپتال میں داخل کرا دیا تھا اور ان کی حفاظت کے لیے پولیس لائنس سے مسلح گارد لگا دی گئی تھی۔ 24 مئی کو وزیر اعظم راجیو گاندھی کے نجی مداخلت سے اسے مرکزی ریزرو پولیس فورس (سی آر پی ایف) کی گارد سے بدل دیا گیا۔ یہ ایک اقدام ہی ان کی تشویش کو واضح کرنے کے کافی ہے۔

اس کتاب پر کام کرتے وقت مجھے وزیر اعظم کے دفتر کے کئی ایسے دستاویز دیکھنے کو ملے ہیں جن سے پتا چلتا ہے وہ اس تفتیش میں ذاتی دلچسپی لے رہے تھے۔ یہاں صرف ایک کا ہی ذکر وزیر اعظم کی دلچسپی اجاگر کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ وی کے جین، ایڈیشنل سکریٹری، وزارت داخلہ، بھارت سرکار نے 12.6.89 کو اتر پردیش کے ہوم سکریٹری، پولیس ڈائرکٹر جنرل اور سکریٹری وزیر اعلیٰ کو ایک ریڈیو گرام بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ "ہاشم پورہ کے واقعہ کے سلسلے میں اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کے ساتھ وزیر داخلہ کے ذریعے منعقدہ بیٹھک کے فوراً بعد وزیر اعظم کے پاس ایک نوٹ بھیجا گیا تھا۔ اتنے گمبھیر مسئلے میں کی گئی کارروائی کی بے حد دھیمی اور اضطراب کن رفتار پر وزیر اعظم نے گہری

فکرمند ظاہر کی ہے۔ وزیر اعظم نے ہدایات دی ہیں کہ تفتیش کی تکمیل اور مقدمہ چلانے، پولیس کے شناخت شدہ گناہ گاروں کی معطلی اور 114 لاپتا لوگوں کے پس ماندگان کو معاوضہ دینے کے لیے بلا تاخیر کارروائی کی جائے۔ وزیر اعظم نے 27 جون تک وزیر داخلہ سے کمپلائنس رپورٹ مانگی ہے۔''ے

سی آئی ڈی کے پولیس سپرنٹنڈنٹ سید خالد رضوی سے ایک لمبی بات چیت کے دوران مجھے پتا چلا کہ کئی بار ایسا ہوا کہ دیر شام کوم پرنسپل سکریٹری یا ہوم سکریٹری کے دفتر سے فون آیا کہ دوسرے دن وزیر اعظم کے دفتر میں ہاشم پورہ معاملے کی تفتیش پر بیٹھک ہوگی اور آدھی رات تک دفتر کھلے رہے، دستاویز کھنگالے گئے، افسروں نے پوری طرح سے خود کو تیار کیا اور صبح سبھی سرکاری ہوائی جہاز میں لدے پھندے دہلی پہنچے۔ بلاشبہ اس طرح کا بلاوا وزیر اعظم کی پہل پر ہی آتا ہوگا اور ان کے دفتر کے افسران بیٹھکوں کے بعد وزیر اعظم کی بریفنگ کرتے رہے ہوں گے۔ وزیر اعظم کے دفتر کو بھیجی اپنی رپورٹ میں سی آئی ڈی نے واضح طور پر ہاشم پورہ کانڈ میں 21 مئی کی صبح مارے گئے پربھات شرما کے بھائی میجر ستیش کے مشکوک رول کا ذکر کیا ہے۔ بعد میں نہ تو سی آئی ڈی کو اس کی سدھ رہی اور نہ ہی وزیر اعظم کے دفتر نے ان سے اس کے بارے میں کوئی پوچھ تاچھ کی۔ تفتیش کاروں نے کئی جگہ ناراضی ظاہر کی ہے کہ دنگوں کے دوران تعینات فوجی افسر بار بار بلائے جانے پر بھی اپنا بیان دینے کے لیے حاضر نہیں ہو رہے ہیں، یا یونٹ کے ریکارڈ دینے میں آنا کانی کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بات کبھی وزیر اعظم کے دفتر کی جانکاری میں نہیں لائی گئی۔ ان کی مداخلت سے سب کچھ حاصل ہونا کتنا آسان ہو جاتا، اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

ان بیٹھکوں کا نتیجہ کیا نکلا؟ کم سے کم میری معلومات تو بہت حوصلہ افزا نہیں ہے۔ بیٹھکیں ہوتی رہیں اور سی آئی ڈی لیپا پوتی کرتی رہی۔ یہ تب جب کہ دہلی میں ایک مضبوط مرکز تھا اور زیادہ تر صوبوں کے وزیر اعلیٰ اس کی مہربانی پر منحصر تھے۔ اس دوران

investigating agency as well as the prosecution have failed to bring on record the reliable material to establish the identity of culprits." Extract from the judgment delivered by Judge Sanjay Jindal on 21st March.

4. "Shree Babudin stated that the culprits were wearing green uniforms and had narrow barrel weapons(It may be pointed out that in the FIRs lodged by Shri Babudin at PS Link Road, there had been no mention of persons wearing green uniforms).

Sri Mujibur Rehman (injured survivor) stated that the culprits were wearing uniforms of deep green colour and did not have weapons like the .303 rifles shown to him during examination. (It may be pointed out that in the FIR lodged by Sri Mujibur Rehman there is no mention of deep green uniform and ballistic report regarding the bullet fragment recovered from a dead body from Hindon Canal says that it was fired by .303 bore rifle)." Extract from the note prepared for Prime Minister Office by S K Rizvi , S.P. C.B. C.I.D. dated 22nd June 1989.

5. "I had further urged immediate removal of the PAC Unit followed by stern action against them. On this, Shri D.S.Bhatnagar had certain reservations and wanted to discuss with Shri P.D.Raturi, D.I.G. PAC Western Sector who was also present there. After discussions with Raturi, Shri Bhatnagar told the chief minister that any action against the PAC at that moment may lead to adverse reaction among PAC men and the possibility of revolt in the PAC could not be ruled out." Extract from D.O. Letter no. E/35/16/292/89-PHQ dated 7th August 1989, written by Nathoo Lal addressed to IG CID Y.N.Saksena.

6. "No detailed orders or instructions regarding the search operations in Hashimpura on 22.5.87 were issued from any level in writing before these searches were conducted, no systems and procedures were prescribed, no allotment of specific duties was ordered and no

responsibilities were fixed, which made these incidents possible." Extract from the note prepared for Prime Minister Office by S K Rizvi , S.P. C.B. C.I.D. dated 22nd June 1989.

7. " a note was sent to the P.M. immediately after meeting held by Home Minister with Chief Minister U.P. at Delhi regarding Hashimpura incident. P,M. has expressed serious concern over the extremely slow and tardy progress of the action taken so far in regard to this grave incident. P.M. has directed that immediate action should be taken now with regard to completion of the investigation and launching of cases , suspension of the identified offenders in the Police force , by giving ex-gratim payment to the families or next of the kin of the 114 missing persons(sic). P.M. has asked for a report from the Home Minister about the compliance by 27th June ...." Extract from the Radio Gram sent by V.K.Jain, Addl. Secretary, Ministry of Home Affairs, New Delhi to Home Secretary, DGP and Secretary to Chief Minister U.P. Lucknow.
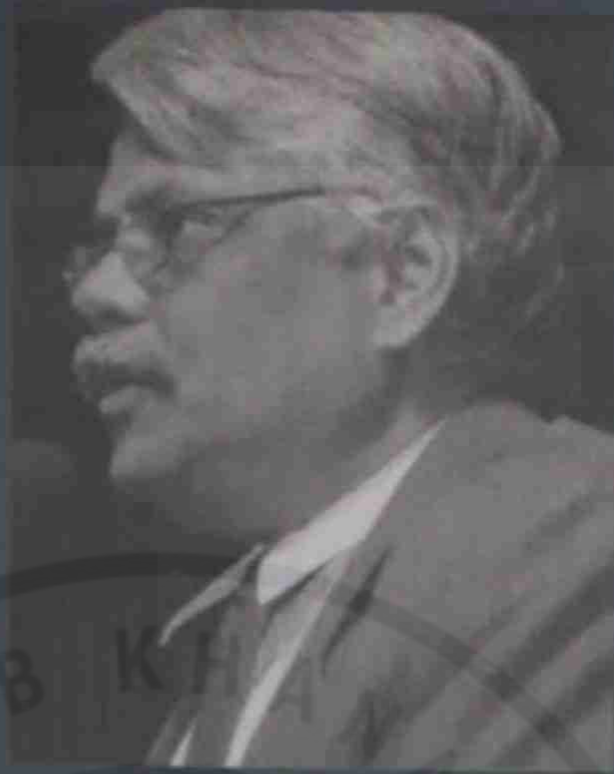
انڈین پولس سروس میں 36 سال تک خدمات انجام دینے والے وبھوتی نارائن رائے (پیدائش 1950) ہندی کے اہم ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول 'شہر میں کرفیو' کا ترجمہ ہندوستان کی تقریباً سبھی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ادیب ہونے کے علاوہ وہ ایک ایکٹیوسٹ کے طور پر بھی معروف ہیں جو ملازمت کے دوران اور ریٹائر ہونے کے بعد بھی ہندوستان میں پھیلی فرقہ پرستی کے خلاف جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف وبھوتی نارائن رائے فی الحال دہلی کے قریب واقع نوئیڈا میں رہتے ہیں۔

ارجمند آرا نے جواہر لال نہرو یونی ورسٹی سے اعلیٰ تعلیم پائی اور دہلی یونی ورسٹی میں اردو زبان و ادب پڑھاتی ہیں۔ وہ اردو اور ہندی میں متعدد کتابوں کی مترجم ہیں جن میں بعض اہم تراجم رالف رسل، طیب صالح، طاہر بن جلون، عتیق رحیمی، میرال الطحاوی اور حسن بلاسم کی تخلیقات پر مشتمل ہیں۔

Hashimpura 22 May
by Vibhuti Narayan Rai
Translated by Arjumand Ara

arshia publications

ISBN 93-87635-20-1
9 789387 635203

+91 9871-77-5988

www.arshiapublications.com